سلطان انجم

ڈوبتے منظر کا سفر

سلطان انجم

یہ کتاب محکمہ السنہ پنجاب کی مالی معاونت سے شائع ہوئی

ڈوبتے منظر کا سفر

سلطان انجم

امروز کتب

عصمت منزل — مالیر کوٹلہ

طبع اوّل: ۱۹۸۹ء
تعدادِ اشاعت: ایک ہزار
قیمت: چالیس روپے
کتابت: رقاص
سرورق: ش۔ علی احمد
طباعت: شالیمار آفسیٹ پریس۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
ناشر: امروز کتب، عصمت منزل، مالیر کوٹلہ (پنجاب) ۱۴۸۰۲۳

ملنے کے پتے:

- پنجاب اردو اکیڈمی، کوٹھی نمبر ۳۳۴۹، سیکٹر ۲۱۔ڈی، چنڈی گڑھ۔
- این۔ایم۔ پبلشنگ ہاؤس، آر ۲/۱۳۸، رمیش پارک، لکشمی نگر، دہلی ۱۱۰۰۹۲
- ۱۲۹۹، سیکٹر ۱۱، پنچکولہ (ہریانہ) ۱۳۴۱۰۹

Rs. 40/-

DOOBTE MANZAR KA SAFAR
SHORT STORIES
By
SULTAN ANJUM

انتساب

والدہ مرحومہ کی شفقت کے نام سے

اس نے چاہا تھا مرے سر پہ رہے دستِ دُعا
شہرِ بے سایہ میں یاد آئی یہ حسرت اُس کی

مندرجات

پیش لفظ — ڈاکٹر نریش — ۹

عرضِ مصنّف — سلطان انجم — ۱۱

(۱) دائرے خیالوں کے — (۱۳)

(۲) نیلی آنکھوں والی چھتری — (۱۹)

(۳) بندھن کچےّ دھاگوں کے — (۲۵)

(۴) جنم جنم کا یہ بن باس — (۳۱)

(۵) طے شدہ سمتوں کے راہی — (۳۷)

(۶) ڈوبتے منظر کا سفر — (۴۵)

(۷) لمحوں میں بٹا انسان — (۵۲)

(۸) ریزہ ریزہ بکھری شام — (۵۹)

(۹) بہتے پانیوں کی آگ — (۶۵)

(۱۰) بند مٹھّی کا بھرم — (۷۱)

(۱۱) بیتے موسم تازہ یادیں — (۷۷)

(۱۲) سائے تِری یادوں کے — (۸۲)

پیش لفظ

—— ڈاکٹر نریش

پروفیسر جدید ادب

بھائی ویر سنگھ چیئر

پنجاب یونیورسٹی،

چنڈی گڑھ

افسانے کا فن ایک ایسا فن ہے جس کے ذریعے قاری کو گرفت میں لے کر اس طرح متاثر کیا جاسکتا ہے کہ اسے اس کی خبر تک بھی نہیں ہونے پاتی۔ لیکن فن کی اس منزل تک پہنچنے کے لیے افسانہ نگار کو ایک طویل سفر طے کرنا ہوتا ہے۔ انسانی معاشرے میں ہر روز کتنے ہی ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جنھیں کہانیوں کا جامہ پہنایا جاسکتا ہے۔ درحقیقت انسان کی اپنی شخصیت ہی ایسی پُراسرار اور ایسی غیر پیش گویانہ ہوتی ہے کہ اسے سمجھنا بھی محال ہوتا ہے اور سمجھانا بھی۔ ایک شخص کا برتاؤ آج جن حالات میں جس طرح کا ہے، یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ کل بالکل ویسے ہی حالات میں اس کا برتاؤ ویسا ہی ہوگا۔ متلون مزاجی فطرتِ انسانی ہے اور اسی سے واقعات کی صورتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ انسان کی اس پیچیدہ شخصیت کو سمجھنے سمجھانے کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی پرانی افسانے کی اپنی تاریخ ہے۔ افسانہ نگار کا مطالعہ اور مشاہدہ جس قدر وسیع ہوتا ہے اس کے فن میں اسی قدر وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے لیکن جب تک اس کا قلم سمتوں کی درپردہ نشاندہی کا ہنر نہیں سیکھتا تب تک اس کے افسانے قصہ گوئی کی حدیں عبور کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

سلطان انجم "ڈوبتے منظر کا سفر" سے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کر رہے ہیں۔ میری دُعا ہے کہ اس سفر میں انھیں وہ منزل نصیب ہو جس کی جستجو میں وہ اس سفر پر نکلے ہیں۔ اپنے گردوپیش کے بیان میں قاری کی دلچسپی کو ملحوظ رکھ کر سلطان نے کہانی پن کی شرط کا لحاظ رکھا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ جو جیسا ہے اُسے اسی صورت میں پیش کیا جائے۔

کسی بھی افسانہ نگار کے اوّلین افسانوی مجموعے سے لافانی افسانوں کی تلاش میرے نزدیک منفی عمل ہے۔ پہلے مجموعے میں جس چیز کی تلاش ہونی چاہیے وہ یہ کہ مصنف میں افسانہ نگاری کی صلاحیتیں کس درجہ موجود ہیں اور افسانہ لکھنے کے ریاض میں اس نے انسانی زندگی کے تئیں کیسا رویہ اختیار کیا ہے۔ یہ دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ سماج میں رونما ہو رہے کن واقعات سے وہ کس طرح سے متاثر ہوا ہے اور ہر اس واقعے کے تعلق سے، جس کو اس نے افسانے میں ڈھالا ہے، اس کا اپنا ردِّ عمل کیا ہے۔ "ڈوبتے منظر کا سفر" میں شامل کہانیوں کو پڑھنے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ سلطان انجم میں افسانہ نگاری کی صلاحیتیں موجود ہیں اور ان کا مستقبل ان کے حال سے تابندہ تر ہوگا۔

نیر لرش

۱۹/۷/۸۹

عرضِ مصنّف

آج کا انسان ذہنی انتشار، محرومی، مایوسی، بے ترتیبی اور بے یقینی کے دور میں سے گذر رہا ہے۔ اخلاقی قدروں کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔ ٹوٹتے ہوئے رشتوں اور ٹکڑوں میں تقسیم ہوتے دلوں کی اس دُنیا میں ہر انسان امن و عافیت اور سکونِ قلب کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ تلاش و جستجو کے اس سفرِ ناتمام میں وہ اکثر تعبیر سے ناآشنا خوابوں کے طلسمی سرابوں میں گُم ہو جاتا ہے یا پھر اس کی حیات کا ایک بڑا حصّہ شکست و ریخت کے ہفت خواں طے کرنے میں صَرف ہو جاتا ہے۔ عام انسان اور ایک فن کار میں یہی فرق ہے کہ جہاں عام انسان مصائب کی یورش تنِ تنہا جھیلتا ہے اور دوسروں کو اس کی ہوا تک نہیں لگنے دیتا، وہاں قلم کار ذہنی عذاب کے ان لمحوں میں اپنے قاری کو بھی شریک کر لیتا ہے۔ "ڈوبتے منظر کا سفر" کے افسانے بھی ذہنی عذاب کے انہی جاں گُسل لمحوں کی بازگشت ہیں۔ ان میں کردار بظاہر تخیّل کا کرشمہ ہیں مگر آپ ان میں افسانہ نگار کو کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود پائیں گے بلکہ — عین ممکن ہے ان کرداروں میں آپ کو اپنی ہی جھلک نظر آئے۔ یوں بھی افسانہ آپ بیتی اور جگ بیتی کا سنگم ہے۔ انا کے دائروں میں مقید رہ کر عصرِ جدید کے تقاضوں سے چشم پوشی ناممکن ہے۔ اس لیے مَیں نے کوشش کی ہے کہ اپنی کہانیوں کو حوادثات کی تفسیروں سے مرصّع کروں۔

میں سمجھتا ہوں کہ افسانہ کی مقبولیت کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے پلاٹ اور کردار روزمرّہ زندگی سے ہی اخذ کیے جائیں۔ معاشرے کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی محرکات سے متاثر ہوکر اپنے دل کی بات کو نوکِ خامہ سے صفحۂ قرطاس پر اُتار دینے میں ہی افسانہ کی بقا اور عروج ممکن ہے۔

"ڈوبتے منظر کا سفر" کے افسانے مسائلِ حیات کی نشاندہی ہیں، اُن کی طرف قاری کی توجہ مبذول کروانے کی سعی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایک ادیب کا دائرۂ عمل اس کے قلم کو اس سے آگے جانے ہی نہیں دیتا۔ مسائل کا حل خود معاشرے کو تلاش کرنا ہوتا ہے۔ اس کوشش میں مَیں کہاں تک کامیاب رہا ہوں، اس کا فیصلہ تو آپ ہی کریں گے۔

آخر میں، مَیں ممنون ہوں مکرمی ڈاکٹر نریش صاحب کا کہ موصوف نے ازراہِ عنایت و شفقت، محض حوصلہ افزائی کی خاطر مجھ جیسے طفلِ مکتب کے افسانوں پر پیشِ لفظ تحریر فرما کر مجھے نوازا ہے۔ میں اپنے عزیز دوست جناب شمشاد صدیقی کا بھی شکر گزار ہوں جن کے خلوص و تعاون سے مجموعہ کی تزئین اور طباعت و اشاعت کے تمام مراحل بحسن و خوبی انجام پائے۔

——— سلطان انجم

ایڈیٹر "تعمیرِ ہریانہ"

ایس۔ سی۔ او ۱۸۹-۱۹۱

سیکٹر ۱۷ سی

چنڈی گڑھ

دائرے خیالوں کے

اور پھر ایک دن یوں ہوا کہ علی الصبح سارے شہر کی گھڑیاں پانچ بجا کر یک دم رُک گئیں۔ رات بھر" جاگتے رہو! ہوشیار!!" کی کرخت اور بے ہنگم صدائیں بلند کرنے والے چوکیدار اپنی اپنی ٹارچیں گلے میں ڈالے، لمبی لمبی لاٹھیاں ہاتھوں میں تھامے، آرام گاہوں کی طرف کوچ کر گئے۔ اخبار فروش اپنی سائیکلس اٹھائے سڑکوں پر نکل آئے۔ بریڈ، انڈے، مکھن کی آوازیں صبح نمودار ہونے کا اعلان کرنے لگیں۔ دودھ بیچنے والوں کی سیٹیاں اور سائیکلوں پر لگے بھونپو کانوں کے پردے پھاڑ دینے پر بضد تھے۔ اتنی گہما گہمی کے باوجود سڑکیں ویران نظر آتی تھیں۔ دفتر جانے والے بابو، بچوں کو پڑھانے والے ماسٹر، ناشتہ تیار کرنے والی فرمانبردار بیویاں اور ہمیشہ کی طرح بس نکل جانے کے خوف سے بغیر ناشتہ کیے گھروں سے نکل کر لوکل بسوں کے دھکّے کھاتے ہوئے فیکٹریوں میں پہنچنے والے بے زبان مزدور، غرض شہر کے سبھی باشندے اپنے نرم گرم لحافوں، پھٹی پرانی بوسیدہ رضائیوں میں دبکے پڑے منتظر تھے کہ کب ساڑھے پانچ بجے والا سائرن بے سُری اور صورِ اسرافیل جیسی آواز سے رات کے خاتمے کا اعلان کرے اور کاروبارِ زندگی شروع ہو۔ لیکن جب سارے شہر کی گھڑیاں پانچ پر آکر رُک گئیں ہوں تو پھر سائرن کس طرح بج پائے۔

صبح دم جاگ کر ادھر اُدھر درختوں پر، مکانوں کی منڈیروں، کھُلے آنگنوں میں چوں چوں کرنے والی چڑیاں جاگ اٹھی تھیں۔ شہروں سے باغوں کی طرف پرندوں کی ہجرت شروع ہو چکی تھی لیکن اس شہر کے انسان ابھی تک رات کے خاتمے اور دن کے آغاز کے لیے اپنی اپنی گھڑیوں کے آگے بڑھنے اور روزانہ کی طرح سائرن کی آواز کے منتظر تھے۔

دور پہاڑوں کی اوٹ سے سورج جھانک کر سوئے ہوئے شہریوں تک اپنی سنہری کرنیں بھیج کر انھیں جاگنے پر مجبور کر رہا تھا مگر لوگ تھے کہ لحافوں میں دبکے پڑے تھے۔ ابھی گھڑی نے ساڑھے پانچ نہیں بجائے تو دن کیسے شروع ہو سکتا ہے! سورج کا کیا ہے، اسے تو نکلنا ہی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ آج رات جلدی بھاگ گئی ہو یا پھر سورج سے مات کھا کر کسی جنگل بیابان کے کونے میں چھپ کر بیٹھ رہی ہو۔

رات شاید ابھی تک قدیم اقدار کے سہارے جی رہی ہے۔ ورنہ سورج کی برتری تسلیم کرنے سے کبھی کی انکار کر چکی ہوتی۔ مکمل انکار نہ سہی کسی روز بطورِ فہمائش اپنے حقوق کی حفاظت کے نام پر سورج کا حکم ماننے سے اُسے آتا دیکھ چھپ جانے سے انکار کرتی ہوئی دو چار گھنٹوں کی اسٹرائیک تو ضرور کر دکھاتی۔

اس دن رات کا نخرہ ساتویں آسمان پر دکھائی دیتا۔ پھر کیا ہوتا؟ — ہونا کیا تھا! صبح کے نو بجے چاروں طرف رات اپنے پنجے گاڑے نظر آتی۔ ---------- سورج اپنی ساری اکڑ فوں بھول کر، اپنا وجود برقرار رکھنے کی خاطر مفاہمت کی کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکالتا۔ اس طرح رات کو تین چار گھنٹے ہی سہی، کھُل کھیلنے کا موقع تو ملتا اور دنیا والوں پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتا کہ رات نے بھی اب پرانی قدروں کا بوسیدہ لباس اُتار پھینکا ہے۔ وہ بھی نئے زمانے کے لوگوں کی طرح اپنی کینچلی بدل چکی ہے

انگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہو چکی ہے۔ لیکن اس بے چاری کو کیا معلوم کہ اس طرح کے بر وقت اقدام سے دُنیا بھر کی انقلابی انجمنوں کی نظر میں وہ کس قدر ممتاز ہو جاتی۔

اگر اتفاقاً یوں ہو جاتا تو خواتین کی بہبود کے لیے قائم بے شمار انجمنوں کی ہنگامی میٹنگیں ہوتیں جن میں اُن کی ایک ہم جنس کے اس دلیرانہ اقدام کی تعریف کی جاتی، قرار دادیں پاس ہوتیں۔ ممکن ہے کوئی زیادہ فعال اور زیادہ منظم تنظیم "رات" کو کسی بھاری بھر کم خطاب سے بھی نواز دیتی کیونکہ آج کل خطاب سے نہ صرف خطاب پانے والے بلکہ خطاب دینے والوں کو بھی اپنی حیثیت کا پتہ چل جاتا ہے۔ خواتین کی یہ انجمنیں اپنی دیگر ہم جنسوں مثلاً زمین، ہوا، آگ، برف وغیرہ کو بھی "رات" کے اس دلیرانہ اور بیباکانہ اقدام کی پیروی کرنے پر اُکساتیں۔ زمین سے کہا جاتا کہ وہ اناج کے بدلے بھوک اُگائے۔ ہوا کو حکم ملتا کہ وہ غنچے کھلانے کی جگہ شاخوں کو نوکیلے کانٹوں سے بھر دے۔ آگ سے استدعا کی جاتی کہ وہ جلانا چھوڑ کر ہر اُس چیز کو جو اُس کی لپیٹ میں آئے یا اُس سے مس ہو، منجمد کر دے۔ برف سے گذارش ہوتی کہ وہ سورج کی شعاعوں سے، آفتاب کی تمازت سے پگھل کر پانی بننے کی بجائے آگ بن کر پہاڑوں کی چوٹیوں سے سرسبز وادیوں کی طرف آگ کے دریاؤں کی صورت میں بہنا شروع کر دے۔ لیکن افسوس رات اتنی نڈر نہ نکلی۔ اس نے کبھی اس طرح کا احتجاج نہ کیا جس سے اپنی ہم جنسوں میں اہم قرار پاتی، برگزیدہ تسلیم ہونے لگتی اور ویمنز لب (WOMEN'S LIB) کی ہم نواؤں کو کچھ کر گذرنے کے مواقع نصیب ہوتے۔

اس روز جب سارے شہر کی گھڑیاں پانچ پر رکی ہوئی تھیں، ایک بچہ جو اسکول جانے کی غرض سے روزانہ ساڑھے پانچ بجے جاگتا تھا، حسبِ معمول اٹھا تو چاروں طرف گھروں میں رات کے آثار نظر آئے۔ باہر دن تھا لیکن کمروں

میں ابھی رات ہی چھائی ہوئی تھی ۔ وہ بھی نا اُمید سا ہو کر واپس اپنے کمرے میں آیا اور لحاف اوڑھ کر دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا کہ شاید یہ کوئی خواب ہو یا کوئی طلسمی اثر ہو۔ ممکن ہے نیند آنے کے بعد وہ اس طلسمی اثر کی جکڑ سے نکل سکے۔ اس کے والدین، اس کے بھائی، اس کے دوست، اس کے پڑوسی، سبھی اس طلسمی اثر کا شکار ہو گئے تھے ۔ جو ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے مگر کچھ بولتے نہیں تھے۔ باہر سے سودا بیچنے والوں کی آوازیں بدستور آ رہی تھیں لیکن کمروں میں محصور لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اور جس طرح گھڑی کی سوئیاں پانچ بجا کر رُک گئی تھیں بالکل اسی طرح کسی اجنبی طاقت نے کمروں میں مقید شہر کے باشندوں سے قوتِ گویائی بھی چھین لی تھی ۔ ان کے ہونٹ معمول کے مطابق ہل رہے تھے ۔ اپنی دانست میں وہ بول رہے تھے لیکن آواز بے آواز ہو کر رہ جاتی تھی، مفہوم واضح ہونا ناممکن ہو گیا تھا۔

اس دوران اُس بچے کو لگا کہ کوئی اجنبی شخص اس کا نام پکار رہا ہے۔ اُس نے لحاف میں سے سر نکالا تو دروازے میں ایک سایہ سا نظر آیا جو اُسے اپنی طرف بُلا رہا تھا۔ وہ بے اختیار اُٹھ کر اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس سائے نے اپنی انگلی بچے کی طرف بڑھائی ۔ بچے نے لپک کر آسیب کی اُنگلی پکڑ لی اور وہ آسیب اسے اپنے ساتھ لے کر چلتا بنا۔

بچہ آسیب کی اُنگلی پکڑے چلتا رہا، چلتا رہا۔ کتنی دیر! معلوم نہیں۔ اب وہ شہر کی ایک بارونق سڑک پر کھڑا تھا۔ اس نے آسیب کی اُنگلی تھام رکھی تھی۔ بچے نے سر اُٹھا کر دیکھا، سورج سامنے کی دو منزلہ عمارت کے عقب سے نکل آیا تھا اور دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سارا شہر اسی طرح نیم بیداری اور ایک بے نام سی غنودگی کے عالم میں صبح کے سائرن کا انتظار کر رہا تھا۔

چاروں طرف سناٹوں کی حکمرانی تھی ۔ سودا سلف بیچنے والے، آدمیوں کو ان کی منزلِ مقصود تک پہنچانے والے دوپائے یعنی رکشہ پُلر، اخبار فروش،

دودھ ملا پانی بیچنے والے گوالے غرض آدم زاد منظر میں سے بالکل غائب تھے۔

آسیب بچے کو ساتھ ساتھ لیے اب شہر کے عین وسط میں اس خوبصورت پارک کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں جانے کے لیے اس شہر کے ہر گھر کے بچے بہت مچلتے تھے اور اکثر گھروں اور اسکولوں سے بھاگ کر اس پارک میں پہنچتے ہی جھولوں میں بندروں کی طرح جھولنے لگتے تھے ـــــ وہ بچہ آسیب کی انگلی تھامے ایک پالتو جانور کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ سورج اب سر پر آچکا تھا۔ اچانک بچے نے دیکھا کہ اس کے ساتھ ساتھ ایک پینٹ شرٹ بھی چل رہا ہے۔ بظاہر بچے نے کسی شخص کی انگلی تھام رکھی ہے لیکن نہ وہ انگلی نظر آتی ہے اور نہ ہی لباس کے اندر موجود شخص۔ بچہ ڈرا ڈرا، سہما سہما انگلی پکڑے چلتے رہنے پر مجبور ہے۔ چاروں طرف کوئی اس کی مدد کرنے والا نہیں۔ اُسے اگر کسی بات کی خوشی ہے تو صرف اتنی کہ اب تک وہ خون جماتی سردی میں صبح سویرے نہا کر اسکول جانے سے بچا ہوا ہے۔ اب وہ دونوں پارک میں پہنچ گئے۔ جہاں سوائے دھوپ، درختوں کی ٹہنیوں پر چہچہاتے پرندوں اور ان دونوں کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں۔ سبھی جھولے خالی پڑے ہیں۔ اس دوران انجانے میں وہ انگلی چھوڑ کر سب سے اونچے جھولے کی طرف بڑھتا ہے تو دو نظر نہ آنے والے مضبوط ہاتھ اسے اٹھا کر سب سے اونچے جھولے میں ٹانگ دیتے ہیں۔ وہ بڑے مزے سے پینگ بڑھاتا ہے۔ پرندے اس کے آس پاس سے ہو کر گذر جاتے ہیں۔ یکایک اُسے لگتا ہے کہ اُس کے پر نکل آئے ہیں اور اس نے بھی ایک ست رنگی چڑیا کی شکل اختیار کرلی ہے۔ وہ بھی ان ننھے ننھے پرندوں کی طرح آسمان میں اڑ رہا ہے۔

اچانک ایک شکاری پرندہ اس پر جھپٹا۔ وہ اس سے بچنے کی بہت کوشش کرتا ہے لیکن چند قلابازیوں کے بعد بالآخر وہ شکرا اُسے اپنے پنجوں میں دبوچ لیتا ہے۔ اپنے ننھے سے نازک بدن میں نوکیلے پنجوں کے گڑتے ہی

اس کی چیخ نکل جاتی ہے۔ تب وہ دیکھتا ہے کہ وہ تو اپنی چارپائی پر ہی بیٹھا ہوا تھر تھر کانپ رہا ہے۔ صبح ساڑھے پانچ بجے کا سائرن ایک پاگل ہاتھی کی طرح چنگھاڑ رہا ہے۔ سڑک بھی جاگ چکی ہے۔ اخبار فروشوں اور سودا سلف بیچنے، خریدنے والوں کا شور اُسے رنگین خواب کی وادیوں سے جیتی جاگتی دنیا میں لے آیا ہے۔ چیخ سن کر اُس کی ممی رسوئی گھر سے بھاگی بھاگی اس کے پاس آتی ہے اور نہایت شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی کہتی ہے۔" عزیز بیٹے! ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تم سو رہے تھے۔ ابھی اوپر سے ایک جہاز بہت نیچی اُڑان بھرتے ہوئے گزرا ہے۔ جاؤ، جلدی جلدی ورزش وغیرہ سے فارغ ہو کر نہالو۔ کہیں کل کی طرح پانی آج بھی چھ بجے ہی نہ چلا جائے۔"

نیلی آنکھوں والی چھتری

آج جب میں دفتر سے ذہن پہ دن بھر کی تھکن اور بے زاری کا بوجھ اُٹھائے۔ اپنے کمرے پہ آیا تو وہ لڑکی اپنے چہرے کو ہاتھوں کے پیالوں میں رکھے اُسی انداز سے کھڑکی میں موجود تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ میں روز شام کو جب دفتر سے لوٹتا ہوں تو کی ہول میں چابی گھمانے سے پہلے ہی مجھے اس کھڑکی کا دھیان آجاتا ہے جس میں ایک بہت خوبصورت مگر سانولی سی لڑکی سراپا انتظار بنی اپنے بیتے موسموں کے ساتھی سے ملن کی دعائیں مانگ رہی ہوگی۔

یہ پُراسرار لڑکی کون ہے؟ کیا ہے؟ کہاں سروس کرتی ہے؟ کچھ نہیں پتہ۔ دودھ والا جب آکر وِسل دیتا ہے تو وہ جھٹ پٹ نیچے آتی ہے۔ اکثر آمنا سامنا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر چُپ کا ہی تالا ملتا ہے۔ میں نے اُسے کبھی بولتے ہوئے سُننا تو ایک طرف رہا، دور سے دیکھا تک نہیں۔ معلوم نہیں وہ کون سا غم ہے جسے یہ اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے۔ دودھ والے کو خالی بوتل دیتی ہے، ایک روپیہ چالیس پیسے اس کے ہاتھ میں تھما کر بھری بوتل اُٹھا کر جس آہستہ روی سے آتی ہے اُسی طرح نہایت خاموشی سے چل دیتی ہے۔ پتہ نہیں اس کے منہ میں زبان ہے بھی یا نہیں۔
یہ لڑکی عموماً ہلکے رنگوں کے لباس پہنتی ہے۔ رکھ رکھاؤ کے

لحاظ سے شادی شدہ لگتی ہے۔ چہرے کے نقوش اس کے کنوارپن کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ اپنی آنکھوں کی جاذبیت اور بے زبانی سے کم سن جان پڑتی ہے۔ کس کس کا اعتبار کیا جائے۔ اس کے رکھ رکھاؤ کا، چہرے کے نقوش کا یا پھر اس کی کچی آنکھوں کا۔ کہیں یہ سب مل کر دھوکہ تو نہیں دے رہے۔ فریبِ نظر کا علاج کون کرے!

آپ سوچ رہے ہوں گے میں ایک لڑکی' پراسرار مگر بظاہر عام سی لڑکی کے ہی بیان میں اُلجھ گیا ہوں۔ بات یہ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جب سے وہ نئی کرائے دار آئی ہے، آس پاس والوں کے اور خود میرے اپنے معمولات میں فرق آگیا ہے۔ ہمارے نیچے رہنے والے شرما جی جو پہلے دفتر سے ہمیشہ لیٹ آتے تھے، اب ٹھیک پانچ بج کر دس منٹ پر گھر پہنچ جاتے ہیں۔ اس سے پہلے ان میں اور ان کی بیوی میں اس بات پر ہمیشہ تکرار رہتی تھی کہ وہ دفتر سے سیدھے گھر کیوں نہیں آتے۔ کئی بار نوبت تو تو میں میں تک پہنچ جاتی تھی لیکن اب تو شرما جی کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔ وہ خود دو دو خالی بوتلیں لے کر دفتر سے آتے ہی گیٹ پہ آکے رک جاتے ہیں جب کہ دودھ والا روزانہ چھ بجے آتا ہے۔ لیکن کیا مجال کہ شرما جی کو پچاس منٹ کے انتظار میں بوریت کا احساس چھو بھی جائے۔ بہانہ دودھ والے کا ہوتا ہے لیکن یہ صرف میں جانتا ہوں کہ وہ چور آنکھوں سے بار بار اسی سمت دیکھتے ہیں جدھر ان کے علاوہ اور بھی بہت سے نگاہیں کسی کی قدم بوسی کا شرف حاصل کرنے کے لیے چکر لگاتی رہتی ہیں۔

پہلے پہل جب میں اس کمرے میں نیا نیا آیا تھا تو ڈرم والا دوسری منزل پر خود دودھ پہنچا جاتا تھا۔ کئی مہینے اسی طرح چلتا رہا۔ لیکن جب سے میں نے سامنے والی اس لڑکی کا معمول نوٹ کیا ہے، صرف

اسی بنا پر اپنے دودھ والے کو جواب دے دیا ہے۔ اب خود نیچے جا کر بوتل والے سے دودھ لیتا ہوں۔ سوچتا ہوں کبھی تو اس پراسرار ہستی کے منہ سے پھول جھڑیں گے۔ پُشپ وَرشا ہوگی۔ ویسے میری یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔

اس کوٹھی کی پشت پر ہائی اسکول ہے جس کا ایک چور دروازہ ہماری اسٹریٹ کی طرف پڑتا ہے۔ اسکول میں پڑھنے والے اِدھر سے کم ہی گذرتے تھے۔ لیکن اب چند دنوں سے کچھ منچلے خاص طور پر اس کوچے کا طواف کرنے لگے ہیں۔ جانے کیوں ہمارے ملک میں کم سنی میں ہی بلوغت کے سبھی اسباق عملی طور پر ازبر کر لینے کے لیے سر توڑ کوشش شروع ہو جاتی ہیں۔ ان کوچہ گردوں میں سے کئی ایک تو ابھی عمر کے اس دور میں بھی داخل نہیں ہوئے جن دنوں آنکھیں نئے نئے خواب دیکھنے لگتی ہیں اور سوتے میں بھی خوابوں کی رنگینی چھپاتے چھپاتے چمک اُٹھتی ہیں۔ ان سب کی نگاہوں کا مرکز بھی ٹاپ فلور کی وہی کھڑکی ہے جس میں سورج غروب ہونے سے پہلے ہی چاند اُبھر آتا ہے۔

یہ منظر مجھے اُن دنوں کی یاد دلاتا ہے جب ہنستی گاتی بوچھاریں جھولوں کو مالا پہناتی تھیں اور رنگ رنگیلی بدلی کورے جسموں کو گرما جاتی تھی اب نہ ہنستی گاتی بوچھاریں ہیں، وہ مالائیں بھی کس کے گلے پڑیں، نہیں کہا جاسکتا۔ کورے جسم، صرف جسم رہ گئے ہیں جن پر رنگ رنگیلی بدلیاں دیکھ کر ہی کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ اب ایسے میں پلکوں پہ اشکوں کی جلتی سلگتی برسات رم جھم کرنے لگتی ہے۔ دُکھ کا احساس بہت ہی پاس سے گذرے تو کھارے پانی کی جھیلوں سے نمکین بخارات کو اٹھنے سے کون روک سکتا ہے۔

شفق! تم بھی کہیں جدائی کے اس عذاب کو ضرور جھیل رہی

ہو گی۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی ملک کی پوش کالونی
میں، ایسے آباد محلوں میں جہاں گھروں میں وال ٹو وال بچے بچھے رہتے ہوں
یا پھر برف پوش وادیوں سے گھرے چند مکانوں میں سے کسی ایک تنہا
مکان کی کھڑکی میں بالکل اسی طرح، اسی پوز میں، اپنے چہرے کو ورقِ
مقدس کی مانند ہاتھوں کی رحل پر رکھ کر اجنبی علاقوں میں مانوس
قدموں کی چاپ، شناسا سا چہرے کی جھلک کے لیے ضرور ترستی ہو گی۔ مجھے
علم ہے کہ تم نے اپنے گھر والوں کے فیصلے پر رضامندی کا اظہار نہیں کیا
تھا بلکہ اپنے دل کی بات، اپنے دل کے بندھن کا بطورِ خاص ذکر کیا
تھا لیکن تم میں بغاوت کی ہمت نہ تھی۔ شاید تمھیں یاد ہو کہ تم اکثر
کہا کرتی تھیں کہ میں نے جس کے دل میں گھر کیا ہے اُسی کے گھر
آنگن میں ایک دن میرے جوبن کا چاند اُترے گا۔ میرے سُونے
آنگن میں تمھارے جوبن کا چاند تو کیا اُترتا، ایک مدھم سی کرن
نے بھی کبھی بھولے سے میرے در پہ دستک نہ دی۔ میں اب بھی
اس ایک لمحے کا منتظر ہوں۔ یہ سامنے والی لڑکی بھی کسی ایسے ہی
معجزے کے رونما ہونے کی آس میں ہے۔ اس کی اداسی دیکھ میں اپنی
شکستہ محبتوں کا دامن سمیٹتے سمیٹتے از خود ریزہ ریزہ بکھرنے لگتا
ہوں ــــ

بالکل تمھاری طرح بادلوں کے موسم میں جب یہ لڑکی ہلکے
آسمانی رنگ کی شلوار قمیض پہنے نکلتی ہے تو نیلی سمندر سی آنکھوں
میں نہ جانے کتنے دلوں کے سفینے غرقاب ہو جاتے ہیں۔

بادل برس کر جب کھلتے ہیں اور یہ اپنی قوسِ قزح سے رنگوں
کی چھتری لے کر نکلتی ہے تو خود بھی نیلی آنکھوں والی چھتری لگنے لگتی ہے،
جس کے سامنے قوسِ قزح کے سبھی رنگ پھیکے اور بے جان پڑ جاتے

ہیں۔ پس منظر میں دور آسمان پر بکھری اِندر دھنش میں دو نیلی آنکھیں کسی ویران جزیرے میں دو نیلے نقطے بن جاتے ہیں۔ جنھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ سمندر نے، آسمان نے نیلی آنکھوں والی اسی چھتری سے ہی اپنا رنگ اُدھار لیا ہے۔

روز کی طرح پھر شام ڈھل گئی ہے۔ دُور درختوں کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے چاند کی زرد اور اداس سی چاندنی سے گھبرا کر، اپنے اندر کے موسموں کی کربناکی سے اُکتا کر یا شاید مسلسل انتظار کے لمحوں کی صلیب سے کل شام تک کے لیے وقت اُدھار لے کر وہ کھڑکی کے پٹ بند کر کے چلی گئی ہے۔ جب انتظار کے لمحے ہی زندگی کا حاصل بن جائیں تو یوں محسوس ہونے لگتا ہے... جیسے زندگی کی ریل سگنل پر آکر رُک گئی ہو۔ سگنل، جو جمود ہے، جمود! جو موت ہے اور موت! پھر حشر کے دن تک کے لیے ایک طویل انتظار۔ ایک ریڈ سگنل....

بندھن کچّے دھاگوں کے

آج سے پہلے اس نے کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا تھا۔ کون سارے کام کاج چھوڑ کر محض آنے والے کل کے بارے میں اپنا مغز کھپائے۔ وہ سمجھتا ہے کہ زمانے کا دستور ہی یہی ہے۔ یا تو دوسروں کو اپنے پیچھے لگاؤ ورنہ خاموشی سے کسی کے پیچھے پیچھے چل پڑو اور یہ سوچنا چھوڑ دو کہ آگے کیا مصیبت پیش آنے والی ہے لیکن آج بیوی کی طرف سے فراہم کی گئی ایک اطلاع نے اُسے جھنجھوڑ دیا ہے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں ایک دم ساری بساط اُلٹ جائے گی اور اس کی حیثیت ایک ناکام مہرے کی سی رہ جائے گی۔ جس سے جو بھی چال چلی جائے اس میں مات لازمی ہے۔

یہ بیوی بھی خدا نے کیا چیز بنائی ہے۔ اس کے بغیر گھر کا ہر کام ادھورا ہر بات نامکمل، ہر داستان بے مزہ، ہر مسئلہ لاعلاج، اُسے نعوذ باللہ خدا سے کوئی شکوہ نہیں کہ اس نے مرد کو قابو میں رکھنے کے لیے اس کی نکیل عورت کے ہاتھ میں کیوں دی۔ عورت مرد کے مقابلے میں جس کی حیثیت اس چوہے سے زیادہ ہرگز نہیں، جس نے جنگل میں ایک اونٹ کو گھاس چرتے دیکھا تو دوڑ کر اس کی مہار اپنے دانتوں میں پکڑ کر ساتھیوں پر رعب گانٹھنے لگا کہ اونٹ میرے اشاروں پر چلتا ہے۔ اس وہم میں آج

کی بیویاں بھی مبتلا ہیں۔

زمانہ جیوں جیوں آگے بڑھتا جا رہا ہے، ترقی کی رفتار تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ برق رفتار سواریوں نے دوریوں کو نزدیکیوں میں بدل دیا ہے۔ برسوں کے سفر دنوں میں بلکہ گھنٹوں منٹوں میں طے ہونے لگے ہیں۔ دور دراز ملکوں کی اصطلاح اب بے معنی سی لگتی ہے۔ کیونکہ جب دوریاں ہی نہ رہیں تو درازیوں کا کیا کام لیکن ٹھہریئے۔ یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔ سہانا، دلفریب، حسین اور خوشنما رخ۔ تصویر کا دوسرا رُخ کیسا ہے، اس کا تصوّر بھی اذیت ناک ہے۔ نئی تہذیب اپنے ساتھ بے شمار مسائل بھی لائی ہے۔ سچّے جذبوں کی ناقدری، رشتوں کی پامالی، ہر فرد کا دوسروں حتیٰ کہ اپنے بزرگوں، مہربانوں، سرپرستوں، مربیوں کو خود سے کمتر سمجھنا اور فہم و دانش میں اپنی برتری کا احساس یہ سب مغربی تہذیب کی نئی نئی بیماریاں ہیں۔ فاصلے کم ہوئے ہیں لیکن دلوں کی دوریاں بڑھی ہیں۔ پہلے زمینیں تقسیم ہوئیں، پھر گھر بٹے اور اب دلوں میں بھی لکیریں کھنچ گئی ہیں۔ انسان اپنے آپ میں سکڑتا سمٹتا جا رہا ہے۔ پہلے قبیلہ اکائی سمجھا جاتا تھا بعد میں اکائی کی روایت خاندان سے پھسلتی پھسلتی اب تنہا فرد پر آکر رُک سی گئی لگتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بدرو اس سے بھی آگے نکل جائے۔

آج کی اطلاع پیرِ تسمہ پا کی طرح اس پر سوار ہے۔ وہ اس کی مکمل گرفت میں ہوتے ہوئے بھی اس طلسم کے ٹوٹنے کا منتظر ہے۔ کوئی چور راستہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کیا کرے، کس سے کہے۔ جس کی ذات سے اُمید کی جا سکتی تھی وہی خود اس کے گرد ریکھاؤں کی تعداد بڑھاتی جا رہی ہے۔ دائرے پر دائرہ کھنچتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا توڑ کوئی منتر ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن اب اسے افسوس ہو رہا ہے کہ اتنی عمر گذر جانے کے باوجود بھی اس نے اس چھو منتر کو حاصل کرنے کی اور پھر اس کو آزمانے

کی ہمت ہی نہ کی۔ موقعے بے شمار ملے، کئی امتحانوں میں سے گذرا لیکن کبھی اس منتر کو سیکھنے یا برتنے کی ضرورت پر ایمان نہ لایا۔ یاروں، دوستوں نے مشورے دیئے خیر خواہوں نے راہ سجھائی مگر اس کے پاؤں اس راستے کی طرف اُٹھے ہی نہیں۔ اسے کیا پتہ تھا کہ زندگی کرنے کے لیے اس اسمِ اعظم کی قدم قدم پر ضرورت پڑے گی اور خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ وہ اپنوں کے بجائے بیگانوں میں گِھر کر رہ جائے گا۔ اور آج کی اطلاع اسی لمحے کی آمد کا بہ بانگِ دہل اعلان ہے۔

ہواؤں میں جملوں کے زہر بجھے تیر چل رہے ہیں۔ ہدف وہی ہے۔ یکہ و تنہا۔ کوئی ڈھال نہیں، کوئی اوٹ نہیں۔ تیر اندازوں کو اس سے کیا کہ کسی کا دل چھلنی ہو رہا ہے یا دماغ میں چھید ہو رہے ہیں۔ انھیں تو تیر اندازی سے مطلب۔ ایسے غیر متوقع موقعے روز روز تھوڑی ملتے ہیں۔ اپنے تیکھے جملوں کا اثر دیکھنے، دست و بازو کی قوت کا مظاہرہ کرنے اور سب سے بڑھ کر دشمن کی قوتِ مدافعت کا اندازہ لگانے کے موقع کو کون ہاتھ سے جانے دینا پسند کرے گا۔ ہواؤں کے دوش پر سب سے پہلا تیر جو اس کے کانوں کے پاس سے گذرا تھا۔ اس کی بازگشت ابھی تک اسے پاگل بنائے ہوئے ہے۔ یہ پہلا تیر اس کمان سے نکلا تھا جو ایسے ہاتھوں میں ہے جنھوں نے کبھی اس کے سامنے ہر دم جُڑے رہنے کے قول قرار کیے تھے۔ یہ ظالم ہاتھ اس چھوئی موئی کے ہیں جسے آج سے کئی برس پہلے قربت داروں کی بھیڑ کے سامنے، دو معتبر گواہوں کی موجودگی میں مقدس کتاب کی مقدس آیات کی گونج میں، اس کے سپرد کیا گیا تھا تاکہ وہ اس کا محافظ بنے، اس کی نگہبانی کرے۔ اسے اپنی مِلک، اپنی کھیتی سمجھے۔ پہلی شب اسے وہ ہاتھ بہت نازک، نہایت بے ضرر اور ان کی مالک حد درجہ معصوم لگی تھی۔ کئی برس اس کا یہ بھرم قائم بھی

رہا لیکن بہرحال بھرم تو ایک دن کھلنا ہی تھا اور کھل گیا۔ اب حالت یہ ہے کہ وہی بازو جو کبھی اس کے گلے کا ہار تھے، آج اس پہ چاند ماری کررہے تھے۔ یہ تغیر کوئی اتنی جلدی اور آسانی سے نہیں ہوا۔ اس چھوئی موئی کو تربیت دینے والے ماہر نے مختلف موقعوں پر، الگ الگ موسموں میں، علیحدہ علیحدہ تقریبات کے بہانے اسے وہ سارے گُر ازبر کروا دیئے، جن کے ذریعے ایک سیدھے سادے انسان کو یوں چٹکیوں میں زیر کیا جاسکتا ہے۔ سارا دن دفتر میں فائلوں کے قبرستان میں دفن رہنے کے بعد کھیتوں کے مزدوروں، پرندوں کی طرح شام کو اپنے گھروندے میں واپس پلٹنے والا ایک کلرک کب اس لائق رہتا ہے کہ اپنی مرضی سے کچھ بول بھی سکے۔ اس ٹیپ ریکارڈر میں تو اپنی مرضی سے جیسی کیسٹ چاہو فٹ کرلو اور پھر بٹن دبا کر اپنے من پسند پروگرام سُن لو—— سمجھ دار بیویاں اپنے شوہر کو ریڈیو بننے کی اجازت کبھی نہیں دیتیں۔ مبادا! ان کا کنٹرول ان کے ہاتھوں میں نہ رہ کر کسی اور کے پاس چلا جائے۔

اُسے یقین ہے کہ اُسے اس صورت سے دوچار کرنے میں یقیناً کچھ حصّہ اس کے اپنے گھر والوں کا بھی ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً جان بوجھ کر اُسے اِگنور (IGNORE) کرنے کی پالیسی پر عمل کرتے رہتے ہیں۔ ویسے بھی جس گھر میں بڑی بھابی کا راج ہو جائے وہاں دوسروں کی پروا کون کرتا ہے۔ حکومت کا نشہ تو اچھے خاصے ذی فہم انسان کو مغرور کر دیتا ہے۔ بڑی بہو تو پھر بہو ہے۔ بہوئیں جو ڈولی میں بیٹھنے سے پہلے یہ سوچ لیتی ہیں کہ ہم تختِ طاؤس پر براجمان ہو رہی ہیں اور اب میاں سمیت سبھی سسرالیوں پر 'مابدولت' کی بندگی لازم ہو گئی ہے۔ اس کے گھر میں اگر بڑی بہو کا حکم چلتا ہے تو یہ کوئی انوکھی بات بھی

نہیں۔ سر پر ساس کے وجود کی تلوار لٹکتی رہے تو ان بہوؤں کو کھُل کھیلنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ جو گھر اس بزرگ ہستی کے سائے سے محروم ہو وہاں بدروحوں کا عمل دخل، خاندان کا شیرازہ بکھیرنے میں پوری طرح آزاد ہوتا ہے۔ اس فطری امر کا شکار اس کا خاندان بھی ہے ـــــ

اس نے گھر والوں کو کئی بار لکھا ہے۔ ملنے پر اُن سے بار بار درخواست بھی کی ہے کہ ہر طرح کے خانگی معاملات میں اسے بھی شریک سمجھا جائے، اسے بر وقت مطلع کیا جائے، اس کی رائے لی جائے۔ ہر ملاقات میں اصولاً یہ بات مان بھی لی جاتی ہے مگر جب کوئی ایسا موقع سامنے آتا ہے تو وہ لوگ اس کی ساری عرضداشتیں، گذارشیں ان چاہی چیزوں کی طرح کباڑ خانے میں پھینک کر بھول جاتے ہیں۔ اسے اکثر اس وقت یاد کیا جاتا ہے جب سارے معاملات بڑی بہو کی مرضی کے مطابق طے ہو جائیں۔ اُسے کئی دفعہ یہ خیال آیا ہے کہ جب معاملہ ہی طے ہو جائے تو پھر مجھ سے ہاں کہلوانے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے لیکن وہ نہیں چاہتا کہ اپنے دل کی بات کا اظہار کر کے گھر والوں کی ناراضگی مول لے۔ اگر گھر والے اسے بالکل ہی نگلیکٹ (NEGLECT) کر دیں تو وہ ان کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ وہ کیسے بھی ہوں، فی الحال گھر والوں سے جُڑا رہنا چاہتا ہے۔ کچّے دھاگوں میں بندھا رہنا چاہتا ہے۔ خون کے رشتوں کی یہ کچی ڈور بھی ٹوٹ گئی تو وہ کہیں کا نہیں رہے گا۔ جب گھر والے ہی ٹھوکر مار دیں تو دوسروں سے گلے لگانے کی اُمید کرتے ہوئے جینا فضول ہے۔ پرائے بھی کبھی اپنے ہو سکے ہیں۔

آج کے تازہ واقعہ نے اس کی خودداری کو، اس کی انا کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ یکدم اس کی حالت آج اس بچّے کی سی ہو گئی ہے جو

میلے کی بھیڑ بھاڑ میں اپنے ہمراہیوں سے بچھڑ گیا ہو۔ جس کے آس پاس انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ضرور ہے لیکن وہ اکیلا ہے۔ اجنبی لوگوں میں اس کے لیے پیار بھی ہے، ہمدردی بھی۔ لیکن یہ سارے جذبے اس اپنائیت کا بدل نہیں ہو سکتے جو اسے اپنے ہمراہیوں سے میسر تھی۔ جس بے لوث چاہت سے اب وہ محروم ہو گیا ہے۔

وہ سوچتا ہے کہ ایک کونج کی طرح جو ڈار سے بچھڑ جانے کے باوجود دوسرے پرندوں میں شامل ہو کر زندہ رہنے پر آسمان کی بے پناہ وسعتوں میں بھٹک بھٹک کر جان دے دینے کو ترجیح دیتی ہے، کیوں نہ وہ بھی اپنوں سے بچھڑ جانے کے بعد غیروں میں نہ مل کر الگ تھلگ رہتے ہوئے رہی سہی زندگی بسر کرے۔ آخر کب تک وہ اپنی بے زبانی کو جی کا وبال بنائے اپنے ہی لہو کی آگ میں جلتا جائے گا۔ یہ سدا بہار رُت تو بدلنے سے رہی۔ وقت کا تقاضا ہے کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کانٹاتی غموں سے سمجھوتہ کرلے۔

زہر بجھے جملوں کی بوچھار جاری ہے۔ "میں نہ کہتی تھی منجھلے دیور کی طرح چھوٹے دیور کی بھی آپ کو شادی کی تاریخ مقرر ہو جانے کی ہی اطلاع ملے گی۔ وہ پہلے کون سی آپ کی رائے لیتے تھے' جواب پوچھیں گے" مگر اس نے تہیہ کر لیا ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ لمحہ لمحہ بکھرتی، سسکتی زندگی کے بھیانک تصور سے خوف نہ کھاتے ہوئے اپنے وجود کی شناخت برقرار رکھے گا اور اپنی انا کو ہرگز ہرگز نیلام نہ ہونے دے گا۔

جنم جنم کا یہ بن باس

رام کو چودہ برس کا بن باس ملا تھا۔ جلاوطنی کے ان چودہ برسوں نے رام کو کتنی عزّت عطا کی تھی۔ وہ اپنے عزیزوں، قرابت داروں خصوصاً اپنے بھائیوں کی نظروں میں اور مہان ہو گئے تھے۔ اپنی سلطنت اور اپنے محلوں سے اتنی طویل جدائی کے باوجود سبھی کے دلوں میں ان کے لیے نرم گوشہ موجود تھا۔ ان ایوانوں سے، راج سنگھاسن سے برسوں کے فاصلے پر رہتے ہوئے بھی ان کی حکمرانی برقرار تھی، ان کا سکّہ رواں تھا۔

اس زمانے اور آج کے دور میں کس قدر تضاد پیدا ہو چکا ہے۔ سوچتا ہوں جب تاریخ اپنے آپ کو دوہرا سکتی ہے تو کیا ویسے ہی حادثات و واقعات بھی نام و مقام اور کردار بدل بدل کر سامنے نہیں آسکتے۔ رام پر بن باس تھوپا گیا تھا، آج کا انسان جلاوطنی خود مول لیتا ہے۔ وہ دولت اور شہرت کماتے نکلتا ہے اور اپنے خاندان سے بہت دور ہو جاتا ہے۔ یہ دوری آہستہ آہستہ اس کے لیے جلاوطنی کا روپ اختیار کر جاتی ہے۔ جب زیادہ مدّت گزر جائے تو اس میں ناکردہ گناہوں کی سزا کے طور پر گھر والوں کے خطوط فردِ جرم عائد کرنے لگتے ہیں۔ اور اس کے سر آئے الزاموں کی فہرست میں اضافہ بیچارے کا مقدر بن جاتا ہے۔

میں لگاتار پانچ راتوں سے ایک ایسے ہی خط کو پڑھ پڑھ کر اپنی بے بسی، مجبوری اور بدنصیبی کو کوستا ہوا سپیدۂ سحری کا استقبال کر رہا ہوں۔ اس شب بیداری میں گھر سے آیا چھوٹے بھائی ذہیب کا تازہ خط مجھے بار بار اس اجنبی دیار سے ان آزاد فضاؤں میں گھسیٹ لے جاتا ہے جہاں کے در و دیوار پہ اب تک میری چاہتوں کے نقوش ثبت ہیں۔ اس خط کی تحریر میں سے ایک شگفتہ چہرہ ابھرتا ہے جو خود میرا اپنا چہرہ ہے۔ یہ شبیہہ مدھم پڑتی ہے تو اس میں سے ایک اور انتہائی پیارا اور معصوم سا چہرہ اُبھرتا ہے۔ یہ ابھرنے والا چہرہ ذُہیب کا چہرہ ہے جو مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے۔

"بھائی جان!

اس سے پہلے بھی میں کئی خط لکھ چکا ہوں۔ آپ نے نہ خطوط کا جواب دیا اور نہ ہی میرے لیے کف لنکس اور سنہرے فریم کے گاگلز بھجوائے۔ اگر آپ نہیں بھیج سکتے تو مجھے جواب کیوں نہیں دے دیتے۔ اس میں شرم کی کوئی بات نہیں۔ میں آپ کی مجبوری کو سمجھتا ہوں کیونکہ آپ کے اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں۔ بیوی کا خرچ، بچوں کا خرچ، باقی کبھی سالا، کبھی سالی، کبھی ساس اور سسر تو کبھی اُن کا کوئی رشتہ دار آیا رہتا ہے۔ اور پھر تیری چیزیں بھی تو کئی سو کی ہیں۔ اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ ہم آپ کے اب کیا لگتے ہیں۔ جو ہماری خاطر پیسے خرچ کرنے لگے۔ باتیں بہت سی ہیں لیکن آپ کو کیوں پریشان کیا جائے۔۔۔

آپ کا بھولا ہوا : ذُہیب

آخر تک پہنچتے پہنچتے میری آنکھوں کے حجروں میں سے مچل کر نکلتے شبنم کے قطرے میرے رخساروں پر سے پھسل کر فصیلِ رُخ کو پار کر کے سلگتے ہوئے دو دریا بطور نشانی دے کر بیڈ شیٹ کی بے شمار سلوٹوں کی ٹھنڈی گیلی دھرتی میں جذب ہو جاتے ہیں۔

جلا وطنی یا بن باس کے ان آٹھ برسوں میں میری روح ایسے بہت سے صدموں سے دوچار ہو چکی ہے۔ وہی غفران جو پہلے گھر بھر کا چہیتا تھا۔ گھر سے آئے خطوط میں جس کے لیے عموماً اس طرح کی محبت اور خلوص کا اظہار ہوتا تھا.... برادرِ عزیز! اپنا نل خراب ہو گیا تھا۔ ابّو ایک مستری کو لائے تھے۔ مرمّت کروا دی گئی ہے۔ پچاس روپے لاگت آئی ہے.... غفران بیٹے! پرسوں تک تمھارے تایا ابا پاکستان سے آجائیں گے۔ تمھارے بغیر رونق نہ ہوگی۔ تم آج ہی گھر چلے آؤ.... بھائی جان! سبھی لوگ عید کی تیّاریاں کر رہے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی باجی سے میری جھڑپ ہو گئی۔ میں آپ کے لیے جو شرٹ پیس لائی تھی اس کا رنگ باجی کو پسند نہ آیا اور وہ اپنا حق سمجھتے ہوئے اپنی پسند مجھ پر لادنے چلیں تو میں نے جھٹ کہہ دیا باجی! رہنے دیجیے، آپ کی پسند ناپسند کون پوچھتا ہے۔ میری اور بھائی جان کی پسند ہمیشہ ایک ہی رہی ہے...

اُسی غفران کو اب اوّل تو کوئی خط لکھ کر منہ لگانا ہی پسند نہیں کرتا یا مجبوراً کوئی خط آتا بھی ہے تو رسمی سی باتوں سے پُر ہوتا ہے۔ گھر کے حالات کا، برادری میں لین دین کا، حتیٰ کہ چھوٹی بہنوں کی سسرال سے آمد یا پھر اُن میں سے کسی کو دی جانے والی چھوچک یا پھر کسی ایسی ہی کسی اہم تقریب کا ذکر بڑے عجیب انداز میں ہوتا ہے۔ ابھی ایک ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہوگی، مہ ناز اپنی سسرال سے آئی ہوئی تھی۔ زچگی سسرال میں ہی ہوئی تھی۔ اس لیے ننھا عبید ساتھ تھا۔ وہ دس پندرہ

دن گھر پر رہی۔ کسی نے مجھے مطلع تک نہ کیا۔ ہاں، اس کی سسرال روانگی سے دو روز قبل لکھا ہوا بھائی جان کا خط آیا۔ تحریر تھا۔ "مہ ناز اپنی سسرال واپس جا رہی ہے۔ ارادہ ہے کہ اُسے چھوڑ دی جائے۔ تمھیں اگر فرصت ہو تو چھٹی لے کر آ جاؤ۔ ویسے تمھاری شرکت کوئی لازمی بھی نہیں۔" یہ اور بات ہے کہ بھائی جان کا یہ خط جس تاریخ کو مجھے ملا۔ اس روز مہ ناز کو رخصت ہوئے تین دن ہو چکے تھے۔

غالباً اس سوشل بائیکاٹ کی ایک اہم وجہ اپنی قلیل تنخواہ میں سے پابندی سے کچھ بچا کر گھر نہ بھیجنا بھی ہو سکتی ہے۔ اپنے وطن میں آرام سے رہنے والے پردیس کے شب و روز اور غریب الوطنی کے مصائب کو کیا جانیں۔ پھر ایسے مشینی شہر میں جس کے متعلق مشہور ہے کہ اگر گراؤنڈ فلور پر رہنے والوں سے چوتھی منزل کے مکینوں میں سے کسی ایک کا بھی نام پوچھ لیا جائے تو آئیں بائیں شائیں کر جائیں۔ میں ایسے جہنم میں جہاں پانی ہوا اور دھوپ بھی قیمتاً میسر آتی ہے، خود ہی پتہ نہیں کیسے گذارا کرتا ہوں، گھر والوں کے لیے چند سو روپے کیسے ہر ماہ بچا سکتا ہوں۔ جب اکیلا تھا تو برائے نام جو کچھ بچتا تھا وہ بھجوا بھی دیتا تھا۔ اب اب تو معاملہ برعکس ہے۔ پہلے اگر دس انگلیاں کماتی تھیں تو بتیس دانت کھاتے تھے۔ اب انگلیاں کمانے والی وہی دس ہیں اور کھانے والے بتیس دانتوں کی تعداد میں پانچ گنا اضافہ ہو چکا ہے۔

میں ایک ننھا پودا ہوں جسے خود ابھی ایسے سہارے کی ضرورت ہے جو اُسے تند و تیز آندھیوں سے، طوفانی بارشوں سے بچا سکے۔ میری جڑیں ابھی زمین میں اتنی گہری نہیں اُتر سکیں کہ اپنے جیسے ننھے پودوں کو سہارا دے سکیں۔ میں جب برگ و بار سے لد جاؤں گا اور ایک چھتنار برگد کہلانے لگوں گا تو سہارے کے لیے اپنی ڈالیوں کی طرف

لپکنے والی بیلوں کو از خود، اپنے سے لپٹا لوں گا۔ چونکہ اُن کے بغیر میرا وجود ادھورا رہے گا، نامکمّل جان پڑے گا۔ بہر حال! مجھے تو خود ابھی سہاروں کی ضرورت ہے۔ مجھے سہارا بنانے اور مجھ سے سہارا چاہنے کی خواہش نقش برآب کی مانند ہے۔

آج چھوٹے بھائی ذُہیب کو جواب لکھ ہی دوں۔ مجھے پتہ ہے کہ میرے خط کا اُسے مجھ سے بھی زیادہ انتظار رہتا تھا یا ممکن ہے اب بھی رہتا ہو۔

"برادرِ عزیز!

تمھاری مطلوبہ اشیاء عنقریب تم تک پہنچ جائیں گی۔ تمھیں حق پہنچتا ہے کہ مجھے قصوروار ٹھیراؤ، مجھ پر فقرے کسو، میری بے بسی کا، کس نصیبی کا مذاق اڑاؤ۔ تم چونکہ مجھ سے چھوٹے ہو اور بڑا بھائی ہونے کے ناطے میرا فرض بنتا ہے کہ تمھاری ہر بات کو، تمھاری طرف سے مجھ پر چپاں کیے جا رہے ہر الزام کو خندہ پیشانی سے برداشت کروں لیکن یہ یاد رہے کہ کبھی تمھیں بھی اس مقام پر سے گذرنا ہے، جہاں آج میں کھڑا ہوں۔ اس وقت تم خود سمجھ جاؤ گے کہ قصوروار میں تھا، حالات تھے یا پھر الزام دینے والے.... سبھی رشتے زر و جواہرات کے گرد نہیں گھومتے، کچھ بندھن اور بھی ہوتے ہیں، جنھیں نہ کوئی نام دیا جا سکتا ہے، نہ جن کی نتا نذہی انسانی اختیار میں ہے۔ تمھارا غفران نہ بدلا ہے، نہ تمھیں بھولا ہے اور نہ ہی اس میں تمھیں بھُلا دینے کی ہمت، نہ فراموش کر دینے پر قدرت حاصل ہے۔ یہ بندھن ٹوٹنے کے لیے نہیں بندھتے۔ ایک بدنصیب بھائی: غفران اعظمی

رام کا بن باس چودہ ۱۴ برس پر محیط تھا۔ سوچتا ہوں آج کے انسان کا بن باس چودہ صدیوں میں بھی شاید ختم نہ ہو۔ جنموں کے اس بن باس کے واقعات، حادثات نام و مقام اور کردار بدل بدل کر سامنے آتے رہیں گے۔ تاریخ اپنے آپ کو دوہراتی رہے گی۔

طے شدہ سمتوں کے راہی

"ورما جی! آپ دیکھ رہے ہیں نا اِسے۔ کل کا چھوکرا کیا اکڑ فوں دکھا رہا ہے۔ کسی کی مانتا ہی نہیں۔ آخر ہم لوگ اس کے دشمن تو نہیں ہیں۔"
"بابو شیام سندرجی، کتنے بھولے ہیں آپ؟ ویسے تو آپ کی عمر گذر گئی بڑے صاحب کے ساتھ کام کرتے ہوئے لیکن اتنا سا نہیں جان پائے کہ سرکاری ملازمت میں ہر نیا نیا آنے والا کرمچاری نہایت مستعدی سے کام کرتا ہے۔ اگر شروع شروع میں ہی امیج بگڑ جائے تو اتنے لمبے سروس پیریڈ کی ناؤ کیسے پار لگ سکتی ہے۔"
"ٹھیک ہے ورما جی، میں آپ سے متفق ہوں کہ کافی دوڑ دھوپ کے بعد ہاتھ لگنے والی ہر چیز کی قدر ہوتی ہے۔ خواہ نوکری ہو، بیوی ہو یا پھر شادی کے دس برس بعد پیدا ہونے والا پہلا بچہ۔ یہ الگ بات ہے کہ نوکری کے نام پر دفتر میں اسٹینو کی جگہ ملے، کوئی منک چڑھی جاہل گنوار سی عورت بطور بیوی پلے پڑے اور پہلی اولاد کی ناک ایسی ہو کہ جسے دیکھ کر شبہ گذرے کہ بنانے والا شاید جلدی میں لگانی ہی بھول گیا لیکن اس ہرجیت کے بچے کو تو اب نوکر ہوئے بھی چار سال ہو چکے۔ دودھ کے جلوں کو چھاچھ پھونک کر پیتے تو دیکھا ہے لیکن

جو دودھ کا جلا ہی نہ ہو، وہ پانی بھی پھونک کر پیے تو دیکھیے نا، رونا آتا ہی ہے۔"

"بابو جی! میری مانو اس موضوع پر بات ہی نہ کرو تو زیادہ بہتر ہے۔ ہر شخص اپنا بُرا بھلا جانتا ہے۔ آپ کے، میرے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہر کوئی اپنے طے شدہ راستے پر ہی چلتا ہے۔ پھر خوامخواہ دوسروں کی نظروں میں بُرا کیوں بنا جائے۔"

ہرجیت بیچارا اپنے ان دو دفتری ساتھیوں کی بات چیت سے بظاہر بے نیاز ٹائپ رائٹر پر جھکا ہوا نہایت انہماک سے صاحب کی تازہ ڈکٹیشن ٹائپ کرنے میں لگا ہوا ہے۔ اسے ٹائپ کرتے دیکھ کر لگتا ہے کہ اس کی انگلیوں کا ٹائپ رائٹر سے بہت پُرانا رشتہ ہے۔ ذرا غور سے کافی دیر تک دیکھتے رہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہرجیت کی اُنگلیاں لفظوں پر نہیں پڑ رہیں بلکہ لفظ خود بے تابانہ اٹھ اٹھ کر اس کی انگلیوں کو پکڑ رہے ہیں، انگلیوں سے چمٹ رہے ہیں۔ ورنہ اکثر ٹائپسٹ تو ہرجیت کی سیٹ پر بیٹھ کر اُنگلیاں کی بورڈ پر مار رہے ہوتے ہیں اور نظریں گڑی ہوتی ہیں سامنے والی کرسی پر سجی ہوئی جاپانی گڑیا سی کلپنا کے حد سے زیادہ کھلے ہوئے گریبان پر۔ ایک ہرجیت ہے جو بدن کی اس طرح کھلے عام نمائش کو اکثر نظر انداز کرتا رہتا ہے۔ کلپنا اُسے اپنے ملکوتی حسُن کی توہین تصور کرتی ہے تو کرتی رہے۔ ہرجیت کو تو ایسی لڑکیوں سے چڑ ہے۔ جو دفتر میں اس طرح بن سنور کر آتی ہیں۔ گویا فیشن پریڈ میں حصّہ لینے کے لیے گھر سے نکلی ہوں۔ بناؤ سنگھار ناز نخرے اٹھکیلیاں، بات بے بات پر کھنکتے ہوئے قہقہے اپنے ڈرائنگ روم اور آنگنوں تک ہی ٹھیک ہیں۔ ان گھر رکھ کے آنے کی چیزوں کا دفتری زندگی سے کیا میل۔ دفتر بہر حال دفتر ہے۔ سیکٹر سترہ چنڈی گڑھ

کے سٹی شاپنگ سینٹر اور دفتر کے ڈیکورم میں کچھ فرق تو رہنا چاہیے۔ مغربی
بے حیائی کس طرح ہماری سماجی زندگی کا حصّہ بنتی جا رہی ہے۔ کلپنا جیسی
دیویاں اسی تہذیب کی معجز نمائی کے چلتے پھرتے اشتہار ہیں۔ دماغ
خراب کر کے رکھ دیا ہے، ہم لوگوں کا مغرب کی نقالی کے اس جنون نے۔
تقلید ہی لازم ٹھہری تو کرو مغربیوں کی وطن پرستی کی، ان کی مہم جوئی
کی، نئی نئی منزلیں سر کرنے کی، یہ کیا کہ بیسویں صدی سے پتھر کے زمانے
کی طرف پلٹتے ہوئے ڈارون کی تھیوری کی ہمہ تن تفسیر بنتے جانا۔ یہ آگے
بڑھنا تھوڑی ہوا۔ یہ تو جہاں سے چلے تھے دوبارہ وہیں پہنچ جانے
کا عمل ٹھہرا۔ معکوس ترقی کے لیے سخت محنت مشقت کی کیا ضرورت۔
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو، مڑ مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھتے رہو۔
وقت خود بخود تمھیں پیچھے چھوڑ جائے گا، ماضی کی طرف دھکیل جائے گا۔
مشین کے ساتھ مشین بنا ہرجیت نہ چاہتے ہوئے بھی خیالی دنیا
سے اپنے آس پاس والوں کی باتوں کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔ زہر میں بجھے تیر
سی اس کھسر پھسر پر وہ اندر ہی اندر کڑھنے کے علاوہ اور کچھ کرنے کی پوزیشن
میں نہیں ہے۔ اس کی انگلیاں رکتے رکتے چل پڑتی ہیں۔ چلتے چلتے پھر
رکی رکی سی ہو جاتی ہیں۔ وہ بھی کانا پھوسی کا شکار ہو گیا جان پڑتا ہے۔
اس کے اندر کی کشمکش اب اس کے چہرے سے جھلکنے لگی ہے۔ انگلیاں قابو
سے باہر ہوتی جا رہی ہیں۔

"لے کے رہیں گے اپنا حق ... ہماری مانگیں پوری کرو، پوری
کرو... دھکے شاہی نہیں چلے گی، نہیں چلے گی، نہیں چلے گی۔"
اس کے کانوں میں پڑ رہے یہ فلک شگاف نعرے اس کو بھی بغاوت
پر اکساتے ہیں۔ ڈارکٹوریٹ میں آج ہڑتال کا دسواں دن ہے۔
سکریٹریٹ کے ملازموں پر عنایات کی بارش نہ ہوتی تو شاید ہرجیت

کو آج یہ سب کچھ نہ سننا پڑتا۔ وہ کئی بار سوچتا ہے کہ ضروری تو نہیں کہ ٹھنڈی ہوا کے فرحت بخش جھونکے کونے تک پہنچیں۔ ابرِ بہار کے لیے کیا یہ لازم ہے کہ وہ گلشن پر ہی برسے، وہ صحرا پر بھی برس سکتا ہے۔ اس بار اسی طرح تو ہوا ہے۔ ابرِ بہار اب کے بھی پرے پرے ہی برسا ہے۔ گلشن اُجاڑ اُجاڑ ہیں تو کیا ہوا، صحرا تو ہرے ہرے ہیں۔

اس طفل تسلی پر ایک اور سوچ غالب آجاتی ہے۔ اس کے اندر سے کوئی سوال کرتا ہے کیا مہنگائی صرف سکرٹریٹ میں کام کرنے والوں کو ہی اپنا شکار بناتی ہے؟ کیا صبح نو سے شام پانچ بجے تک صرف انھیں ہی فائلوں سے سر کھپانا، ٹائپ رائٹر سے انگلیاں پھوڑنی پڑتی ہیں۔ مہنگائی کسی خیراتی ادارے کے لیے چندہ وصول کرنے والی دوشیزہ تو ہے نہیں کہ سکرٹریٹ کے ملازمین کو موٹی توند والے سیٹھ سمجھ کر صرف ان سے ہی چپکتی ہے۔ یہ تو آئی فلو کی رشتہ دار ہے۔ کسی کو بخشنا اس نے سیکھا ہی کب ہے۔ ملازم خواہ سکرٹریٹ کے ہوں یا ڈائریکٹوریٹ کے اس کی نظروں میں تو سب برابر ہیں۔ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ مساوات کے اس دور میں مہنگائی ہی تو ہے جو محمود و ایاز کو راشن کی دوکان پر ایک ہی لائن میں کھڑے رہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جن کو مہنگائی راس آجاتی ہے وہ اس قتالہ کا بھی ناس مار دیتے ہیں۔

اس کا جواب ہر جبیت کے پاس ہے کبھی نہیں بھی۔ آخر وہ بیچارا کون کون سے سوال کا جواب دے۔ یوں ہی اگر جواب میں سے سوال نکلتے رہے، اس کے ارد گرد جمع ہوتے رہے، اس کو

اپنے آپ سے الجھاتے رہے تو وہ صاحب کی ڈکٹیشن کیا خاک ٹائپ کر پائے گا۔ پہلے ہی ایک فل پیج ٹائپ کرنے کے بعد پھاڑ چکا ہے۔ کیونکہ نہ جانے کیسے ایک جگہ اس سے 'لے کے رہیں گے اپنا حق'، ٹائپ ہو گیا تھا۔ اگر یہ صفحہ خدانخواستہ کہیں صاحب کے پاس پہنچ گیا ہوتا تو اس کی کیا رہتی۔ وہی صاحب جو اس کی ٹائپنگ کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے، اسے دو چار جلی کٹی سنا ہی دیتے۔ افسر ہیں، انھیں یہ حق تو حاصل ہے ہی نا۔

یہ سوال بھی لاجواب سے ہو کر ہر جیت کے منہ تک رہے ہیں۔ اب اس کی صرف انگلیاں ہی ٹائپ رائٹر سے چپکی ہوئی ہیں۔ کی بورڈ میں سے اس کی بوڑھی اور بیمار ماں کا چہرہ جھانکتا ہے۔ اس چہرے کی آنکھیں بھی سوال کر رہی ہیں۔ ہاں! ہر جیت سے سوال کر رہی ہیں۔ کیا وہ ہڑتال میں شامل ہو کر اپنی تنخواہ کٹوا لے گا؟ بیمار ماں کی دوائی کا خرچ اب برداشت نہیں ہوتا تو کیا اس سے بھی کم تنخواہ میں وہ دوائیاں خرید پانے کی سکت رکھے گا؟ ماں کے چہرے میں سے اس کی جوان بہن کی شبیہہ ابھرتی ہے جس کی شادی ابھی تک صرف اس لیے نہیں ہو پائی کہ ہر جیت کی تنخواہ میں سے کل سو روپے بچتے ہیں۔ شادی کے اخراجات کے لیے کم از کم دو سو روپے ماہانہ بچت ہو، تب بات بن سکتی ہے۔ وہ معصوم بہن جیسے ہر جیت سے پوچھ رہی ہو۔ "بھیا وہ خواب صرف خواب ہی تو نہ رہ جائیں گے کہ اگلے مہینے سے جو سالانہ ترقی ہونی ہے اس سے تم اپنی تنخواہ میں سے دو سو روپے بچانے کے اہل ہو سکو گے کہیں سو سو روپے کر کے بچائے ہوئے چند ہزار روپے بھی بے کاری کے ایام کی نذر نہ ہو جائیں گے۔ ابھی اور کتنے برس جوان بہن کو گھر بٹھانے کا ارادہ ہے۔

ہر جیت ابھی گم سم اُن سوالوں میں ہی کھویا ہوا ہے کہ جوان بہن کے پیچھے پیچھے چھوٹا بھائی بھیگی پلکیں لیے آن موجود ہوتا ہے۔ وہ بھی سوالی ہے کہ مجھے ایم۔بی۔بی۔ ایس میں داخل کروانے کے لیے پیسوں کا انتظام ہوا کہ نہیں۔ محکمہ میں اسکوٹر لون کے لیے دی گئی درخواست پر ملنے والے چھ ہزار روپے میں سے ایڈمیشن کے لیے کتنے بچانے ہیں۔

وہ کس کس کے سوال کا جواب دے۔ سوچنے کے لیے کوئی وقفہ نہیں، صلاح کس سے کرے، صحیح مشورہ کون دے سکتا ہے؟ کھائی میں دھکیلنے والے ہمجولیوں سے کسی نیک کام کی توقع کی جا سکتی ہے؟ اوپر سے خیر خواہ بننے والے اپنے اندر کیا چھپائے ہوئے ہیں، اس کی خبر اسے نہیں ہے، اندازہ ضرور ہے۔

یہ بابو شیام سندر جو اسے کام چھوڑ کر ہڑتالیوں میں شامل ہونے کا بار بار سجھاؤ دیتا ہے، کیا اُس کا سچّا بہی خواہ ہے؟ نہیں، بالکل نہیں۔ وہ ہر جیت کو نوکری سے ہاتھ دھوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس میں اس کا اپنا فائدہ جو ہے۔ اس کے بیٹے نے اسی برس بی۔اے کی ہے۔ ٹائپ سیکھ رکھی ہے۔ جو باپ دفتر میں بابو لگا ہوا ہو، وہ اپنے بیٹے کو آخر بابو ہی تو بھرتی کروائے گا۔ ہر جیت کے ہڑتال پر جانے کی دیر ہے کہ اس کی نوکری ختم ہو جائے گی۔ وہ جانتا ہے کہ UN-CONFIRM ملازم کی کیا وقعت ہوتی ہے۔

ورما جی دل سے ہر جیت کو چاہتے ہیں۔ اُن کی مرضی یہی ہے کہ وہ ہڑتال نہ کرے کیونکہ وہ اس کے مضر اثرات سے بخوبی واقف ہیں۔ اُن کا اپنا داماد وپن آج سے دس برس قبل اسی طرح دیکھا دیکھی کی ہڑتال میں اپنی لگی لگائی نوکری سے برخاست ہو چکا ہے۔ یہ ورما جی کا دل ہی جانتا ہے کہ دس برس کے اس لمبے عرصہ میں انھوں نے

کتنی کوششیں کی ہیں کہ کسی طرح دپن کہیں ایڈجسٹ ہو جائے لیکن ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ابھی تنگ آکر پچھلے برس ہی انھوں نے دپن کو ایک چھوٹا موٹا ٹی اسٹال کھلوایا ہے۔ تاکہ ان کی بیٹی اور نواسے اچھا کھا پہن تو سکیں۔

لیکن ورما جی بھی بے بس ہیں۔ انھوں نے دبے لفظوں دو چار بار اپنے ہڑتالی ساتھیوں سے کہا بھی ہے کہ وہ بیچارے ہر جیت پر رحم کھائیں۔ اسے ہڑتال پر مجبور نہ کریں لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ ورما جی ترس ہر جیت پر نہیں کھا رہے بلکہ اپنے داماد دپن پر کھا رہے ہیں۔ مگر دل کی بات کون جانتا ہے۔ چھل کپٹ کے اس زمانے میں سچ کو سچ ثابت کرنے کے لیے کتنے جھوٹ، بولنے پڑتے ہیں۔

صاحب کی طرف سے دی گئی تازہ ڈکٹیشن ٹائپ ہو چکی ہے۔ آس پاس والوں کے ریمارکس ہر جیت کو بہکانے اور اُسے صحیح راستے سے ادھر اُدھر کرنے پر اُتلے ہوئے ہیں۔ لیکن ہر جیت کے اردگرد معقول سوالات کا ایسا حصار ہے، اتنی مضبوط فصیل ہے کہ اگر ایک چھوڑ ہزاروں نیلام سُندر بھی جمع ہو کر اُسے ڈگمگانے پر تُل جائیں تو ہر جیت کو طے شدہ سمتوں کے سفر سے نہ روک پائیں گے۔

ڈوبتے منظر کا سفر

اپنی لمبی ناک والی ماں کے ہاں دو برس گزارنے کے بعد گذشتہ ہفتے بڑی بھابی آخر آہی گئیں۔ یہ جلاوطنی دراصل بڑی بھابی کے اپنے نصیبوں کا پھل نہیں تھی بلکہ اُن کی ماں کے ہی کرموں کی سزا تھی۔ سنتے آئے ہیں کہ بُرے کام کرنے والوں کو آخرت میں اذیت ناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ بڑی بھابی بھائی جان سے دور رہ کر اسی دنیا میں اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت چکی ہیں۔ ناکردہ گناہ اس لیے کیونکہ بڑی بھابی کی اپنی رضامندی سے یہ سب کچھ نہیں ہوا تھا۔

یہ دیس نکالا بڑی بھابی نے اس وقت مول لیا تھا جب دو دو سال پہلے چھوٹی بجیا کی خان فیملی سے بات آنے پر بڑی بھابی کی ماں چراغ پا ہو اٹھی تھیں۔ وہ حیران تھیں کہ جس رشتے کے لیے انھوں نے کئی برس تک اپنے تلوے گھسائے تھے خان فیملی سے ہاں کہلوانے کے لیے اتنے پاپڑ بیلے تھے، وہی رشتہ چھوٹی بجیا کے لیے گھر بیٹھے بٹھائے کیونکر منظور ہو گیا۔ چھوٹی بجیا، جس کے سر پر مشفق ماں کا سایہ نہ تھا۔ ماں، جو ایک سایہ دار چھتنا ور درخت کی مانند اپنے بچّوں کو زمانے کے سرد و گرم سے بچاتی ہے جس کے دامن میں منہ چھپانے سے دونوں جہان کی خوشیاں

ملتی ہیں۔ ہم بچپن میں ہی ماں کی محبتوں اور شفقتوں سے محتاج ہو چکے تھے۔ اب تو امّی کی ایک دھندلی سی تصویر ہی ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ رہ گئی ہے۔ البتہ خوشی یا غم کے موقعوں پر اب بھی اس تصویر سے یہ ساری دھند چھٹ جاتی ہے۔ دو مہربان آنکھیں ہر وقت ہماری نگہبانی کرتی لگتا ہے۔ خوشی کی محفلوں میں ہمارا ساتھ دیتی ہیں۔ رنج و الم کے موقعوں پر ہماری ڈھارس بندھاتی ہیں۔

بیتے دنوں کی یادیں خوشگوار بھی ہوتی ہیں، کربناک بھی۔ یادوں کی یہ پروائی کبھی محرومی کا احساس فزوں کرتی ہے تو کبھی بے رنگ و بے نام یادیں جینے کی اُمنگ بڑھاتی ہیں۔

یہ سہیل، جو آج بھرپور جوان نظر آتا ہے۔ ان دنوں بمشکل تین برس کا رہا ہوگا۔ امی کو کینسر ہو گیا تھا۔ ایک سال میں ہی امّی کے ہر دم مسکرانے والے چہرے پر سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ایک بے نام سے کرب اور عجیب سی بے چینی نے اس مسکراہٹ کی جگہ لے لی۔ مرض نے شدّت اختیار کی۔ انھیں اسپتال میں داخل کروا دیا گیا لیکن بے سود۔ ایک روز امّی کی طبیعت یکدم ناساز ہوئی۔ نانی اماں نے اُٹھا کر بٹھایا۔ امّی کا دل گھبرا رہا تھا۔ سچرتے ہوئے۔ سُرخ و سپید تھوک۔ ہم سمجھے امّی نے ابھی ابھی جو پان کھایا تھا، یہ سُرخی اسی کی ہے۔ لیکن یہ کیا؟ اچانک ان کی آنکھوں کی پُتلیاں عجیب طرح حرکت کرنے لگیں۔ بیشتر اس کے کہ کسی کو آواز دی جاتی، ڈاکٹر آتا، امّی کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ ایک دم کہرام مچ گیا۔ وہ ہمیشہ کے لیے ہم سب سے روٹھ گئی تھیں۔

یہ زخم ابھی تازہ تھا کہ نانا ابا پر فالج نے حملہ کیا۔ وہ بھی جانبر نہ ہو سکے اور امّی کے ساتھ ہی جا ملے۔ نانی اماں ان پے بہ پے صدموں سے نیم جان ہو گئی تھیں، ایک روز خاموشی سے وہ بھی اسی کارواں میں شامل ہو گئیں جس میں امّی اور نانا ابا ان کی راہ تک رہے تھے۔

یہ سب باتیں آج اس طرح کیوں یاد آ رہی ہیں جیسے کل ہی کی بات ہو۔

اگر یہ سب لوگ ہم میں موجود ہوتے تو بڑی بھابی کے قدم اس دہلیز کو پار کرنا تو درکنار شاید چھو بھی نہ پاتے۔ امی تو شروع سے ہی تائی سے رشتہ جوڑنے کو تیار نہ تھیں البتہ تایا ابا کا ہم سب آج ہی کی طرح احترام کرتے تھے لیکن بڑی بھابی کی ماں سے اُن دنوں بھی ایسی ہی نفرت تھی۔ آج تو وہ نفرت آگ کا دریا بن چکی ہے۔ امی کے ہوتے تو وہ بے بس تھیں، اب اُن کی بن آئی۔ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ انھوں نے تایا ابا سے کہہ سن کر جھٹ پٹ بھائی جان کو پھانس لیا۔ اور معزور ماں کی نک چڑھی بیٹی، ہماری تایہ زاد نازیہ بڑی بھابی بن کر ہمارے گھر آگئیں۔ تائی نے ایک اہم محاذ سر کر لیا تھا۔ اب انھوں نے آہستہ آہستہ دوسرے مورچوں کی جانب پیش قدمی کی۔ چھوٹی بجیا کو مٹھی میں کر لیا۔ نادان چھوٹی بجیا نے منجھلی بھابی کے خلاف محاذ آرائی میں بڑی بھابی کا ساتھ دیا۔ لیکن خان فیملی سے رشتہ آنے پر تائی اپنے اصلی روپ میں سامنے آگئیں۔ ان کا یہ روپ ہمارے لیے کوئی نیا تو نہ تھا البتہ انوکھا ضرور تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ اب وہ قلعہ کے صدر دروازے سے داخل ہو کر قلعہ پر قابض ہو چکی ہیں۔ ان کی ہوس پوری ہو چکی ہے۔ اس لیے ان سے بھلائی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ہمارے ہتھیار ڈالنے کے بعد یہ توقع فضول بھی نہ تھی۔ اب تک ہم سپہ سالار یعنی مرحومہ امی کے بغیر اس قلعہ کو شکست وریخت اور دراندازیوں سے محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ لیکن کب تک! تجربہ کار جرنیل کے بعد آخر فوجیں لڑ بھی کتنی دیر سکتی ہیں!!

چھوٹی بجیا کی بات آنے پر تائی بڑی بھابھی کو لے گئیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ گئیں کہ اگر ان کی مرضی کے خلاف خان فیملی کی طرف ہاتھ بڑھایا گیا تو ان کی چہیتی بیٹی اس دہلیز پر کبھی قدم نہیں رکھے گی۔ شاید وہ اس زعم میں مبتلا تھیں کہ بڑی بھابی، ان کی جانشین، ملکہ نازیہ اگر ہمارے گھر کو بے یار و مددگار چھوڑ دے گی تو دشمنوں کے لشکر چہار جانب سے ہم پہ یلغار کریں گے۔ اور بلند و بالا فصیلیں ہمارے کچھ کام نہیں آئیں گی۔

لیکن چھوٹی بجیا، خالہ، منجھلی بھابی اور خود بھائی جان کی حکمتِ عملی سے ہم نے غنیم کو اپنے پاس تک نہ پھٹکنے دیا۔ تائی کی اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔

بعد میں چھوٹی بجیا کی خان فیملی میں نسبت طے کر دی گئی۔ کئی بار ہم لوگ بڑی بھابی کو لینے گئے۔ لیکن تائی کے آگے کس کی پیش جاتی۔ انھیں اب بھی یہ بھرم تھا کہ شاید ہم لوگ ان کی مان لیں اور یہ رشتہ ٹوٹ جائے۔ لیکن ہم نے اُن کی ناراضگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے نہایت سادگی سے چھوٹی بجیا کو دُلہن بنایا اور چشمِ پُرنم سے اسے ایک نئے سفر کے لیے رخصت کیا۔ رخصتی کے وقت تایا ابّا کے علاوہ ادھر سے کوئی نہ آیا۔ ایک معمولی سی بات سے پیدا ہوا خلا اب تائی کی ناسمجھی کے باعث ایک بے پایاں خلیج بن چکا تھا۔ دو سال تو تائی نے کسی نہ کسی طرح کاٹ لیے لیکن شادی کے بعد جوان لڑکی کو گھر بٹھانا کون سا آسان ہے۔ تائی کے کس بل نکلنے لگے۔ اب وہی بیٹی انھیں بوجھ لگنے لگی، ہار ماننا اپنی ہتک محسوس ہوا۔ جھوٹے وقار کا معاملہ جو ٹھہرا۔ ہماری مسلسل خاموشی پر وہ فکر مند ہوئیں اور لوگوں سے اپنی نیم رضامندی کا ذکر کرنے لگیں۔ اس موضوع پر بات نکلنے پہ یہ کہنے سے نہ چوکتیں۔ "میری بیٹی صرف ایک شرط پہ اس گھر میں جا سکتی ہے، وہ یہ کہ اسے الگ کمرہ ملے گا، الگ کھانا بنائے گی، گھر والوں سے اس کا کوئی ناطہ نہیں ہوگا۔ وہ نہ ان لوگوں کے کپڑے صاف کرے گی، نہ جھاڑو نکالے گی اور نہ ہی جھوٹے برتنوں کو چھوئے گی۔" بھائی جان اور ہم سب کو یہ شرائط منظور نہ تھیں، اس لیے معاملہ لٹکتا رہا۔

ان دو برسوں نے تائی کو برادری کے طعنوں اور خود ان کے اپنے ضمیر کی لعنت ملامت کے سوا کچھ نہ دیا۔ ویسے بھی آج کے دور میں کنواریوں کو "ور" نہیں ملتے۔ شادی شدہ زندگی کا پنج سالہ تجربہ رکھنے والی لڑکی کو کون گھاس ڈالے گا۔ ممکن ہے تائی جیسی جہاندیدہ عورت کی نظریں کبھی تصویر کے اس رُخ کی طرف بھی گئی ہوں۔

آہستہ آہستہ بھائی جان کے ارادے متزلزل ہونے لگے۔ بالآخر بیوی کی یاد نے انھیں بے چین کرنا شروع کر دیا اور بقول ان کے "اپنے گھر کے حالات اور مصلحت کے پیشِ نظر انھیں بازی ہارنا پڑی"۔ وہ بڑی بھابی کو منا لائے۔ چھوٹے سے گھر میں ایک کمرہ ان کے لیے مخصوص ہو گیا۔ جس گھر کی دہلیز پر تائی نے کبھی اپنی بیٹی کے قدم نہ پڑنے دینے کی قسم کھائی تھی۔ بڑی بھابی کو اسی "لکشمن ریکھا" کو عبور کرنا پڑا۔

اب کئی دنوں سے گھر میں عجیب منظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہمارے چھوٹے سے گھر کی چھوٹی سی رسوئی میں دو چولہے سلگتے ہیں۔ ایک پر منجھلی بھابی کھانا پکاتی ہیں۔ دوسرے پر بڑی بھابی کی ہنڈیا چڑھتی ہے۔ ہم سب منجھلی بھابی کے ہاتھ کا بنا کھاتے ہیں۔ بھائی جان بڑی بھابی کی چپاتیوں سے پیٹ بھرتے ہیں۔ بڑی بھابی اور بھائی جان کا رُخ مغرب کی طرف ہے اور ہم سب مشرق کی طرف دیکھتے ہیں۔ اس رسوئی میں جہاں اب تک ایک چولہا جلتا تھا سبھی ایک دوسرے کے ساتھ، کندھے سے کندھا ملا کر کھانا کھاتے تھے ـــــ

اب پیٹھ سے پیٹھ ملا کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ سگے بھائی بہن غیروں کی طرح ایک دوسرے کی طرف پشت کر کے کھانا کھاتے ہیں۔ خون کے رشتوں میں دراڑ پڑتی جا رہی ہے۔ ذہنوں میں بغاوت کے جراثیم پلنے لگے ہیں۔ بھائی جان ہمارا سالن نہیں چکھتے تو ہم اُن کی چائے کیوں پئیں؟ بڑی بھابی اپنا کمرہ صاف کرتی ہیں۔ بھائی جان ناشتہ کر کے دفتر چلے جاتے ہیں۔ بڑی بھابی برقعہ سنبھال کر ٹریننگ اسکول اپنے مائکے، سدھارتی ہیں۔ جہاں شام تک ان کی کلاسیں ہوتی ہیں۔ اکثر وہیں سے "ایک آدمی" کا کھانا ساتھ باندھ لاتی ہیں یا پھر بھائی جان سیدھے آفس سے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ نئی نویلی دلہن کی ناراضگی کون مول لے۔

ایک خوشگوار تبدیلی بھی آئی ہے۔ شام کو ہمیشہ دیر سے گھر لوٹنے

والے بھائی جان اب دفتر سے سیدھے گھر آتے ہیں۔ بڑی بھابی کے لیے سودا سلف لاتے ہیں۔ سورج غروب ہونے کے بعد گھر سے باہر نہیں نکلتے۔ ان کی لامحدود سرگرمیاں مثلاً دوستوں سے ملنا، ورکرز یونین کے لیے کام کرنا، دوسرے شہروں میں یونین کے ہمدردوں کا حلقہ وسیع کرنے کے لیے دو دو، چار چار روز گھر سے غائب رہنا وغیرہ اب محدود ہوتی جارہی ہیں۔ یہ سبھی سرگرمیاں ایک دائرے میں سمٹ آئی ہیں جن کا مرکزی نقطہ غالباً بڑی بھابی کی ذات ہے اسی لیے وہ ورکرز یونین کے نعروں کی گمشدہ آب وتاب بڑی بھابی کے روئے پرنور میں تلاش کرتے ہیں۔ اس تلاش میں وہ اس قدر کھو گئے ہیں کہ دو دو، چار چار روز کے سفر کی بجائے ایک طویل مسافت طے کرنے میں مگن ہیں۔ البتہ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ بڑی بھابی، بھائی جان کے شریک سفر کی حیثیت رکھتی ہیں یا خود انھوں نے ہی گنجلک اور کبھی نہ ختم ہونے والی راہوں کی شکل اختیار کر رکھی ہے، جن راہوں میں بھائی جان اپنے بہن بھائیوں کی پہچان تو کیا خود اپنی شناخت بھی گم کر چکے ہیں۔ ممکن ہے بڑی بھابی آج کل "حقوقِ زوجین" پر انھیں لیکچر پلارہی ہوں، جس کی خاطر خواہ تربیت انھیں ٹریننگ اسکول سے ملتی ہی رہتی ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور۔

ابھی چند لمحے پہلے بھائی جان نے اپنے ہاتھوں سے مرحومہ امّی کی سلائی مشین، چھوٹی بجیا کی چپلیں، منجھلی بھابی کے سینڈل، دو ایک یادگار قسم کے بٹن کی پرانی وضع قطع کے ٹرنک جن میں امّی خود بھائی جان کے اور ہمارے کپڑے انتہائی سلیقے سے رکھا کرتی تھیں، اپنے کمرے سے باہر نکالے ہیں بیتے دنوں کی یادیں پھٹی پرانی لیروں کے ساتھ چاروں طرف بکھر گئی ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ دو نازک ہاتھ اس ٹرنک کو کھول اور بند کر رہے ہیں۔ اس انداز میں گویا ہمارے اور بھائی جان کے کپڑے رکھے، نکالے جارہے ہیں۔

امی سلائی مشین چلا رہی ہیں۔ ننھے سہیل کا فراک سِل رہا ہے۔ مشین کی کھٹ کھٹ میں چوڑیوں کی کھنک شامل ہو کر ایک مدھر تان بن گئی ہے۔ ایک ساز ہے جو بج رہا ہے اور روح کی گہرائیوں میں اُترتا جا رہا ہے۔ دوپہر کا وقت ہے۔ ہم سب کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہیں۔ سلائی مشین اور چوڑیوں کی مِلی جُلی آوازیں سُنا رہی ہیں۔

امی سب کام نبٹانے کے بعد جب مشین پر بیٹھتی تھیں تو ہمیں اپنے سامنے چاندنی پر لٹا لیتی تھیں تاکہ گرمی کی دوپہر میں چلنے والی تیز لوئیں ہمارے چہروں کو نہ جھلسا سکیں اور ہم سب سلائی مشین اور چوڑیوں کی جلترنگ کو سنتے سُنتے خواب کی وادیوں میں پہنچ جاتے تھے۔ یہی دن تو ہوا کرتے تھے۔ اب بھی تو جون ہے۔ باہر گرم لوؤں کے تھپیڑے چہرے جھلسا رہے ہیں۔ چھوٹی بجیا دور پردیس میں ہے۔ باقی سب اپنے اپنے کام پر گئے ہوئے ہیں۔ منجھلی بھابی دونوں بچوں کو لیے سو رہی ہیں۔ میری طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں، جانے کیوں بار بار ان بچھڑنے والوں کی یاد ستا رہی ہے۔ میں تن تنہا اس کمرے میں لیٹا ہوں۔ میرے کانوں میں پھر امی کی مشین اور چوڑیوں کے بجنے کی مِلی جلی آوازیں آ رہی ہیں۔ کتنا سکون مل رہا ہے اس وقت مجھے! بھائی جان کے کانوں تک یہ سبھی آوازیں کیوں نہیں پہنچ رہیں، گویا انھوں نے کچھ بھی نہ سُننے کی قسم کھا رکھی ہو۔ اور سب کچھ سنتے ہوئے بھی ایسے بن رہے ہیں جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ ممکن ہے بڑی بھابی نے ان سے دیکھنے، سننے اور محسوس کرنے کی سبھی قوتیں چھین لی ہوں ورنہ وہ ایسے بے حس تو نہ تھے۔

بڑی بھابی کے کمرے سے باہر ٹنگی ہوئی مشین پر امی صاف نظر آ رہی ہیں۔ تیرہ برس ہوئے آج سے پہلے میں نے جاگتی آنکھوں سے انھیں اتنا قریب کبھی نہ دیکھا تھا۔ سلائی مشین کی آواز اور چوڑیوں کی کھنک لوریاں دے رہی ہے۔ غنودگی سی طاری ہو رہی ہے۔ میرے آس پاس اور کوئی نہیں

ورنہ میں اسے بھی امّی کے دیدار ضرور کراؤں۔ سبھی اپنے حال میں مست ہیں۔
بھائی جان اور بڑی بھابی کی ہنسی بار بار اس طلسم کو توڑ رہی ہے۔ وہ دونوں
بھی تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی، خاموش کیوں نہیں ہو جاتے؟ تاکہ میں امّی کو
دیکھتے ہوئے اور ان کی لوریوں کو سنتے ہوئے آہستہ آہستہ نیند کی دنیا میں
پہنچ جاؤں، سو جاؤں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے، کبھی بیدار نہ ہونے کی خاطر....

لمحوں میں بٹا انساں

آج وہ دفتر سے پانچ بجنے سے کچھ دیر پہلے ہی نکل آیا تھا۔ ایک ضروری کام نے اس کے ذہن کو الجھا رکھا تھا۔ وہ دن بھر مجبوراً فائیلوں سے سر کھپاتا رہا تھا۔ اس کی سیٹ پر جتنے بھی کیس آئے تھے، اُن پر نوٹنگ بظاہر سادہ لفظوں میں تھی مگر جانے کیا بات تھی کہ ہر فائل کے نوٹ کو کئی کئی بار پڑھ لینے کے بعد بھی وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اسسٹنٹ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اکثر یوں ہی ہوتا ہے کہ آپ کسی جملے کو روا روی میں پڑھ جاتے ہیں، بغیر رکے، بغیر اٹکے، بغیر سوچے، بغیر دم لیے۔ اس کا مفہوم آپ کی سمجھ میں آ بھی جاتا ہے لیکن بعد میں آپ کا ذہن بعض اوقات پڑھے ہوئے جملے کی طرف لوٹنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اس بات کی صراحت، اس کی تفصیل جاننے کے لیے۔ مگر اس کے ساتھ تو ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ تیس برس سال کی خدمت گزاری انسان کو بہت کائیاں بنا دیتی ہے۔ وہ فائل چھو کر ہی اس پہ ہوئی نوٹنگ کے بارے میں جان جاتا ہے۔ قیافہ شناسی کا یہ فن عمر کے اس حصے میں بے حد راس آتا ہے۔ رونا تو یہی ہے کہ یہ تیس برس سال کی سروس ایک معمولی سے کام نے صفر کر دی تھی۔

اسے دفتر سے اس طرح وقت سے پہلے نکل آنے کا غم بھی تھا اور خوشی

بھی بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ خوشی ہو رہی تھی تو شاید زیادہ صحیح ہو۔ بات یہ نہیں ہے کہ وہ دفتر سے آوارہ گردی کے لیے اٹھ آیا تھا۔ جیسا کہ اُن دفتروں میں نظر آتا ہے جو شہر کے کسی مرکزی اور بارونق علاقے میں ہوں۔ ایسے علاقے کے دفترو ں میں عام طور پر لوگ سیٹوں پر کم ہی ملتے ہیں۔ آپ اپنے کسی ملنے والے کے پاس جائیں تو پتہ چلے گا کہ "وہ ابھی ذرا باہر تک گئے ہیں۔ کوئی خاص کام ہو تو بتا دیجیے، انھیں آتے ہی بتا دیں گے۔" جب کہ آپ کے "وہ" جن سے ملنے کی خواہش دل میں دبائے آپ ناکام و نامراد لوٹ آئے، کہیں قہوہ خانے میں چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے حساب لگا رہے ہوں گے کہ کیوں نہ گھر ہی ہو آئیں۔ سیٹ پر کون سا کام ہے۔ ساتھ والے کو کہہ ہی آئے ہیں۔ کوئی ملنے والا ٹپک پڑا تو وہ سنبھال لے گا۔

اس کے جی میں کئی بار آیا ہے کہ یہ سہ حرفی لفظ "ذرا" دنیا سے نیست و نابود کیوں نہیں ہو جاتا۔ کیا کیا جائے کہ اس لفظ "ذرا" کے وجود سے بعض حضرات کو تصویرِ کائنات میں رنگ نظر آتا ہے اور وہ برملا کہتے ہیں کہ اس رنگ کے بغیر بے رنگ دنیا بیرنگ خط کی طرح ہو جائے گی۔ بیرنگ خط جسے نہ تو بھیجنے والا قبول کرتا ہے اور نہ پانے والا اس کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ملتا ہے۔ بالآخر یہ بیرنگ خط جبراً و قہراً نامہ بر یعنی پوسٹ مین کو ہی کئی دن تک سنبھالنا پڑتا ہے کہ رجسٹر میں اس کا اندراج ہو چکا ہوتا ہے۔ یہ نقد نامہ اب ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ ایسے ان چاہے خط تو ناجائز حمل کی طرح کسی کو کانوں کان خبر ہوئے بغیر جہنم رسید کر دیے جاتے ہیں۔

ذکر ہو رہا تھا ذرا کی اہمیت کا مگر قلم پھسل کر کسی اور طرف چلا گیا۔ اصل میں بعض لفظ کراماتی ہوتے ہیں۔ یہ کیا کم کرامات ہے کہ آدمی ایک ہی وار میں بہک جائے۔ اس لیے جب آپ کو کسی ملنے والے کے بارے میں یہ پتہ چلے کہ وہ "ذرا" کہیں گئے ہیں تو سمجھ لیجیے کہ مخاطب آپ کو

بہکا رہا ہے۔ اگر آپ نے اس "ذرا" کو ذرا سمجھ لیا تو یقین مانیے کہ آپ نے کوئی عقل کا کام نہیں کیا۔ جس طرح بعض حالتوں میں عقلمند لوگ انکار کو اقرار سمجھ لیتے ہیں، اسی طرح آپ بھی ذرا کہنے والے کے بہکاوے پر ایمان لے آئیے کہ اب آپ کی مُراد پوری ہرگز نہیں ہو سکتی۔ آپ کے درست اپنی سیٹ پر کم از کم آج کی تاریخ میں تو ملنے والے نہیں اور کل .... کل کس نے دیکھا ہے۔

دفتر سے جلدی نکل آنے کی وجہ وہ مراسلہ ہے جس میں ایک معروف ادبی جریدے کے مدیر نے اس سے تازہ کہانی کی فرمائش کی ہے۔ کہانی فوراً بھجوانے کی تاکید بھی کیونکہ میگزین چھپنے کے لیے پریس بھیجا جانا ہے۔ اُسے فرمائش کا تو اتنا خیال نہیں لیکن یہ فکر ضرور دامن گیر ہے کہ اس کے ساتھ نتھی ہوا چیک کہیں بیکار نہ چلا جائے۔ پتہ نہیں ایڈیٹر لوگ قلمکاروں کو ایک کمپیوٹر کیوں سمجھتے ہیں کہ ایک فرمائش بمعہ چیک پہنچتے ہی جھٹ سے تازہ بہ تازہ تخلیق حاصل ہو جائے گی۔ ہر کام کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔ ہر پھل سبزی کے لیے موافق آب وہوا اور مناسب موسم ضروری ہے۔ اگر آپ خواہش رکھیں کہ ابھی مٹی میں آم کی گٹھلی بوئیں، جھٹ سے ایک تناور درخت نمودار ہو جائے اور اس پر پیلے پیلے پکے ہوئے آم لگے ہوں تاکہ آپ سیر ہو کر کھا سکیں، لوگ اسے خود فریبی یا خوش فہمی نہیں تو اور کیا کہیں گے۔

ابھی پچھلے دنوں دفتر میں بڑے بابو سے ایک کلرک کا جھگڑا ہوا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ کلرک بادشاہ کو اسٹور سے دو بال پین اِشو ہوئے تھے۔ اتفاق دیکھیے کہ اس دن حضرت رخصت پر تھے۔ بڑے بابو نے یہ سوچ کر لے لیے کہ جب آئیں گے تو انھیں دے دیں گے۔ لیکن انسان فطرتاً حریص بھی تو ہے۔ کلرک بادشاہ مہینہ بھر چھٹی پر رہے۔ واپس آئے تو پتہ چلا کہ اسٹور سے ان کے نام پر اِشو ہوئے بال پین بڑے بابو کے پاس ہیں۔ بڑے بابو سے کہا گیا تو وہ

ایک ہین سے رٹرخا کر دوسرا ہین ہضم کر جانا چاہتے تھے۔ اس بات پر تُو تُو، مَیں مَیں ہو گئی اور معاملہ ڈائریکٹر صاحب تک پہنچ گیا۔

سریش کو خیال آیا کہ کیوں نہ اس واقعہ کو بنیاد بنا کر کہانی تیار کر لی جائے مگر بُرا ہو اس چائے والے کا جو دفتر کے باہر عین گیٹ کے پاس، سڑیوں میں بابوؤں کو گرم کر کے اپنی جیب گرم کرتا رہتا ہے۔ جس نے موقع غنیمت جان کر سریش سے اپنے کاروبار کی بدحالی کا رونا روتے ہوئے بلا تکلف کہہ دیا کہ بابو جی پچھلے چار مہینے کا بل چکا دیجیے۔ سریش نے سوچا کہ مجھ سے تو غریب چائے والا ہی اچھا ہے۔ اسے چار کپ کے لیے کہو۔ ابھی تین کپ پانی، ایک کپ دودھ، چار پنج شکر اور دو چمچ چائے پتی ڈال کر پکائے گا اور جب اسے کیتلی سے انڈیلے گا تو کڑک چائے سے چار کپ لبالب بھر جائیں گے۔ کیا اسے تخلیق کار نہیں مانا جا سکتا؟ اسے چائے کے لیے آرڈر دیا، وہ بھی اُدھار مگر چائے حاضر۔ اور ایک میں ہوں کہ فرمائش کے ساتھ چیک ملتی ہے مگر کہانی ہے کہ ہین سے سیاہی کے ساتھ نکل کر کاغذ پر پھیل ہی نہیں رہی۔ سریش کے اندر بھی تو صبح سے کچھ پک رہا ہے۔ پھر بھی پتہ نہیں کس آنچ کی کمی ہے کہ پکنے والی شے اُبلنے کا نام نہیں لیتی اور آپ جانتے ہیں کہ جب تک کوئی شے اُبلنے نہ لگے، اس وقت تک باہر نہیں آتی۔ صرف پکنے سے تو فن کے تقاضے پورے نہیں ہو جاتے۔ فن تو اُبل کر کناروں سے باہر آ جانے کا نام ہے۔ کوئی شے دوسروں کے سامنے آئے تبھی اسے نام دیا جا سکتا ہے۔ کون یقین کے ساتھ دعویٰ کر سکتا ہے کہ سیپ میں سُچّا موتی بند ہے۔ بعض اوقات بھری پُری کوکھ سے بھی رسولی جنم لیتی ہے، بچہ نہیں۔

مگر وہ ایک چائے والے کی کہانی کیوں لکھے؟ مغرور چائے والا، جس کا کام ہی اُبلتا ہوا رنگین، بدمزہ پانی پلا کر لوگوں کو مُبلے کرنا ہے —— وہ بابوؤں کو ان کی چائے کے بل سے ناپتا ہے اور اگر کوئی بھولے سے اسے

حساب میں غلطی رہ جانے کی بات کہہ دے تو وہ گردن ناپنے میں کبھی شرم محسوس نہیں کرتا۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ اس چائے والے کی کہانی لکھنا تو درکنار، اپنی کہانیوں پر اس کا سایہ بھی نہ پڑنے دے گا۔

دورانِ تعلیم سلیبس کی کسی کتاب میں اس نے پڑھا تھا کہ اِدھر اُدھر رونما ہونے والے واقعات وحادثات فوراً سچے" فن کار کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ پھر وہ جگ بیتی کو آپ بیتی کے پیرائے میں بیان کر دیتا ہے۔ جس طرح تلوار کی دھار کو اور تیز کرنے کے لیے اسے آب دینی پڑتی ہے۔ بالکل اسی طرح فن کار کو اُلٹے سیدھے، بے جوڑ واقعات کو اپنی ذہنی اُپج کا سہارا لے کر حد درجہ پرکشش اور دلفریب بنا کر بیان کر دینا ہوتا ہے۔ تو کیوں نہ وہ بھی کھلی آنکھوں سے آج پیدل مارچ کی بجائے لوکل بس میں گھر پہنچے۔ یقیناً سفر میں اُسے کہانی کے لیے مسالہ ہاتھ آہی جائے گا۔

وہ اسی دُھن میں بس اسٹاپ پر رُک گیا۔ بس آئی تو وہ سوار ہوتے ہی سب کچھ بھول کر اپنی کہانی کی کھوج میں مگن ہو گیا۔ ہر چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ بڑے غور سے سواریوں کی آپسی گفتگو، کانا پھوسی سننے لگا کہ کچھ تو ہاتھ لگے گا۔ بس میں بھیڑ زیادہ ہونے کی وجہ سے اسے جھٹکے اور دھکے" ہی ملے۔ اسی دھکم پیل میں وہ کفِ افسوس ملتا ہوا اپنی منزل تک پہنچ گیا مگر من چاہی مُراد پوری نہ ہوسکی۔

بس سے اُتر کر وہ فٹ پاتھ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک بڑھتے ہوئے ہاتھ نے اُسے روک لیا۔ جب چیکر نے اس سے ٹکٹ مانگا تو اس کے خیالات ریزہ ریزہ ہو گئے۔ اب اسے یاد آیا کہ ٹکٹ تو وہ خریدنا ہی بھول گیا تھا۔ ٹکٹ چیکر کو کیا پیش کیا جائے۔ بلا ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں اسے سزا بھی ہو سکتی تھی، جرمانہ بھی۔ اس نے مختلف بہانے لگا کر چیکر کو اپنی بھول کا یقین دلا کر پیچھا چھڑانا چاہا مگر بات نہ بنی۔ چیکر نے اس

پر دس روپے جُرمانہ کر ہی دیا۔ گھر سے نکلتے وقت، اُسے بیوی نے جیب خرچ کے لیے مشکل سے ۱۰ روپے دیے تھے۔ وہ اُسی طرح جیب میں پڑے تھے۔ اُس نے چُپ چاپ وہ روپے نکال کر چیکر کے ہاتھ پر رکھ دیے اور اپنا سا منھ لے کر گھر کی راہ لی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کی نظر ایک مہمان پر پڑی۔ اس کا موڈ جو پہلے ہی خراب تھا، اب اور بھی بگڑ گیا۔ ایسے میں بھلا کہانی کیسے لکھی جا سکے گی۔

اس کے جی میں آئی کہ وہ ماہنامے کے دفتر سے آیا چیک اس بھلے مانس مہمان کے حوالے کر دے اور کہے کہ کھانے کے بعد آپ اس چیک کا بھی ذائقہ چکھ لیں۔ کہانی لکھنے کا موسم شاید ابھی نہیں آیا تھا۔ اور وہ اس بات پر قادر نہیں تھا کہ جنوری کے مہینے میں آم کے پیڑوں کو پیلے پیلے شیریں آموں سے بھر جانے کا حکم دے سکے۔ آموں کا موسم ابھی بہت دور ہے۔ بہت دور۔

ریزہ ریزہ بکھری شام

کافی دیر تک وہ اسے اِدھر اُدھر تلاش کرتا رہا۔ وہ کہیں نظر نہ آئی۔ اس کے بغیر بیٹھک سُونی سُونی جان پڑتی تھی۔ عجیب ماجرا تھا، اس سے کسی کو کیا دشمنی ہوسکتی تھی۔ بے ضرر شے سے کون خوف کھاتا ہے۔ بیٹھک کی تلاش کے بعد نمبر دالان کا آیا، وہاں بھی اس کی آنکھیں اُسے نہ دیکھ پائیں۔ وہ بہت پریشان ہوا کہ آخر وہ گئی تو کہاں؟ پہلے خیال گذرا کہ کسی کی نظر میں رہی ہوگی، موقع دیکھ کر لے گیا۔ لیکن اس میں ایسی کون سی خوبی تھی۔ نہ ناک نقشہ درست تھا، نہ رنگت اچھی تھی اور پھر اسے اب پسند بھی کون کرتا! کسی بھی شے پر جب کسی نام کی مہر ثبت ہوجائے، ٹھپہ لگ جائے تو اسے پانے کی خواہش کرنے والے بھی ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ دستور ہی کچھ ایسا ہے۔ جب کوئی شے ہاتھ سے نکلتی نظر آئے تو بروقت گرفت مضبوط ہوگئی ٹھیک، ورنہ بعد میں ہاتھ ملنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔

'ملکیت' کتنا تحفظ ہے، کتنی قوت ہے اس پنج حرفی لفظ میں۔ اور جب اس کے ساتھ تین لفظ 'کسی اور کی' آن ملیں تو یہ ایک نامکمل، ادھورا سا جملہ بھی بیسیوں فرمانوں پر بھاری ہوجاتا ہے۔ 'کسی اور کی ملکیت' کی اس وزنی سل کو ہلانا دِل گُردے کا کام ہے۔ لوگ دل پہلے ہی ہارے ہوتے

ہیں۔ اکیلے گُردے بھی بہت جلد ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

ایسے موقعوں پر الزام بے چاری تقدیر کے سر آتا ہے، فتح ملے تو اپنی بہادری، جوانمردی کے قصّے بیان ہوتے ہیں۔ شکست ہو جائے تو خود صاف نکل جاتے ہیں اور طعن و تشنیع کے جس قدر جھاڑ جھنکار ہوتے ہیں، وہ تقدیر کے ارد گرد لپیٹ دیتے ہیں۔ جتنے دل فگار تیر ہوتے ہیں ان کے آگے سینہ سپر ہونے کے بجائے ڈھال آہستگی سے ایک جانب کھسکا کر، خود بھی تماش بینوں میں شامل ہو کر تقدیر کے سینہ چھلنی ہونے کا تماشہ دیکھتے ہیں۔

اُسے وہ خود سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ غریب الوطنی کے دلوں میں بھی اُسے یہ احساس رہتا تھا کہ چلو، میں گھر والوں کی خوشی میں، غمی میں شریک نہ سہی، وہ تو اُن کے درمیان ہے۔ دل کے بہلاوے اور تسکین کے لیے دور پردیس میں، جدائی کے موسموں کی صلیب پر ٹنگے یہ خیال، یہ طفل تسلی، غموں کی باڑھ کو آگے بڑھنے سے تو روک ہی دیتی تھی۔ اب وہ کیسے تصوّر کی آنکھوں سے اپنے گھر، اپنے گھر والوں میں خود کو موجود سمجھ سکے گا۔ لے دے کے ایک یہی تو مشترک اثاثہ رہ گیا تھا۔ وہ کیا کرے؟ کس سے کہے؟ کس سے اس کے بارے میں پوچھے؟ سمجھ میں نہیں آرہا تھا ـــــ

جس سے بھی اس کا ذکر کرے گا، وہ یہی سوچے گا کہ اُسے مجھ پر ہی شک ہے۔ شک والا معاملہ پُرانے سے پُرانے بندھن بھی منٹوں میں توڑ دیتا ہے۔ یقین و اعتماد کے مضبوط و مستحکم قلعوں کی موٹی موٹی فصیلو ںمیں بھی پل بھر میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ شک کی تخریب کاری کا اثر ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ شک تو پوٹا شیم سائنائیڈ ہے، ذائقہ کا احساس ذہن کو چھوا، یقین و اعتماد کی بلند و بالا عمارت آناً فاناً بیٹھ گئی۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے، ایک جگہ سوتے ہوئے، جاگتے ہوئے، وہ کیسے

اپنے شک کا اظہار کرے۔ کمان سے نکلا تیر، منہ سے کان تک گئی بات اور شک کا اظہار ایسے پرندے ہیں، جو ایک بار اُڑان بھرنے کے بعد کبھی اپنے ٹھکانوں پر واپس نہیں پلٹتے۔

اب اُسے نہ کھانا اچھا لگا، نہ نیند کی دیوی آنکھوں کی وادیوں میں اُتری۔ بیڈ پر لیٹے لیٹے چاند ستاروں کی آنکھ مچولی دیکھتا رہا۔ شفاف چاندنی ننھے ننھے تاروں کو ہڑپ کر کے اپنا حسن دوبالا کرتی رہی۔ پھر دن کے سورج کی آمد کے خوف سے چاند کا روپ ماند پڑنے لگا۔ اسی ادھیڑ بن میں دن نکل آیا۔

اب وہ اپنے دُکھ کسے دے، کس سے دل کی بات کہے۔ کسی کے ساتھ دُکھ بانٹنے سے دُکھ کا احساس کم ضرور ہو جاتا ہے لیکن تجربے نے اُسے اب تک یہی بتایا تھا کہ دُکھ کا ذکر دُکھ سے بھی زیادہ دُکھی کر دیتا ہے۔ مشاہدہ اور تجربہ.... ان دونوں میں سے اُسے پہلے مشاہدہ پر اعتبار تھا لیکن مشاہدہ نے آہستہ آہستہ اُسے یہی سکھایا کہ تجربہ مجھ سے بھی بڑھ کر ہے۔ بشرطیکہ عقلِ سلیم بھی اس وقت ساتھ ساتھ یا آس پاس ہو۔ ورنہ تجربہ عموماً غلط نتائج کو درست بتا کر انسان کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔

یہ گمشدگی کا سارا جھگڑا ہی اُس وقت سے شروع ہوا تھا جب اس کے جی میں مشاہدہ کے بعد تجربے کے لمس کی خواہش بیدار ہوئی تھی۔ اب تک وہ یہی سمجھتا تھا کہ اُس کا مشاہدہ آئندہ زندگی میں اس کا ساتھ دے گا۔ مصیبتوں کے پُل پر سے اُسے بحفاظت اُس پار اتار سکے گا۔ لیکن تجربے کے پہلے زینے پر قدم رکھتے ہی مشاہدہ اس سے بھی پہلے پل صراط پر سے کٹ کر زندگی کے جہنم کے بھڑکتے شعلوں میں گر گیا۔ اس سے ڈر کر وہ خود بھی تجربے کے پہلے زینے پر ہی جم کر رہ گیا۔ نچلا دھڑ پتھر کا ہو گیا۔ آنکھیں کھلی تھیں، سب کچھ دیکھتی تھیں لیکن وہ ہل جل نہیں سکتا تھا۔ ہاتھ اس کے بس میں ہیں۔

لیکن پاؤں پتھر ہو چکے۔ نصف سلطنت باغی ہوئی۔ کس کے سہارے یہ اب دوسرا قدم بڑھا کر دشمن پر وار کرے۔ خود کو بچانا ہی مشکل ہو رہا ہے۔

ان سب خیالات کو وہ بار بار ذہن سے جھٹکتا ہے۔ لیکن خیالات بدنامی کے داغ کی طرح یوں چپکے ہیں کہ الگ ہی نہیں ہو رہے۔ اس کی تلاش جاری ہے۔ ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا کہ وہ کہاں گئی۔ کون لے گیا۔ بیچارا کتنا دکھی دکھی لگ رہا ہے۔ غم کے بادل آنکھوں کے آسمان کو مکمل طور پر ڈھانپے ہوئے ہیں۔ پھر بھی ہمت نہیں ہاری۔ اب بھی اُمید کے سورج کی ایک آدھ بچی کھچی کرن کی رہنمائی میں اسے تلاش کر رہا ہے۔ تلاش کرتے کرتے وہ رک کیوں گیا۔ شاید کچھ یاد آگیا ہے۔ یہ خلا میں کیا گھور رہا ہے۔ دماغ نے اس کی انگلی پکڑ کر فیصلے کی منزل پر لا کھڑا کیا ہے۔۔ اسے یاد پڑتا ہے کہ چھوٹے بھائی مختار انیس کی نظرِ کرم اس پر کچھ زیادہ ہی تھی۔ ایک بار وہ اس کے ایک ایسے کام سے انکار کر چکا ہے جو اس کے اختیار سے اس کی پہنچ سے باہر تھا۔ مختار انیس کو غصّہ اس بات کا تھا کہ اس نے میرا چھوٹا سا کام کیوں نہ کر کے دیا۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی کو کیسے بتائے کہ وہ ایک غلطی بار بار کرنے میں یقین نہیں رکھتا۔ وہ بھی جوانی کے بہکاوے میں آکر ایک بار ایسی ہی مذموم حرکت کر چکا ہے۔ اس وقت وہ بھی اسے محبت ہی سمجھتا تھا لیکن بعد میں یقین آگیا کہ وہ محبّت نہ تھی محض "سکین رَج" تھا۔ محبت اتنی ارزاں، ناپائیدار اور ڈرپوک کہاں ہوتی ہے جو والدین کی ایک ہی جھڑکی پر رو دے اور نہ چاہتے ہوئے بھی خاموشی سے ڈولی میں بیٹھ کر کسی اجنبی آنگن میں جا اترے۔ ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسے جانا وہ کیونکر گوارا کرتا۔

اس خیال کے جلتے بجھتے جگنوؤں کی روشنی میں وہ مختار انیس کے کمرے کی طرف بڑھا۔ ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا تو وہ جس کی تلاش میں کئی دنوں سے سرگرداں تھا، شکوک و شبہات کے صحراؤں میں

ننگے پاؤں بھٹک رہا تھا، اس کے سامنے تھی۔ لیکن اس حالت میں کہ کوئی بھی حصّہ اپنی جگہ پر نہ تھا، سر کہیں تھا، بازو کہیں۔ یہ حشر کرنے والے نے نہایت خوبصورتی سے اسے اپنے بستر کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ شاید اس نے یہ نہ سن رکھا ہو کہ اگر خنجر کی زبان چپ رہتی ہے تو کئی بار آستین کا لہو بھی پکار اٹھتا ہے۔ اتفاقاً یا پھر جلدی میں اس کا ایک ٹکڑا بیڈ شیٹ کے نیچے سے گر پڑا تھا۔ جس کی وجہ سے گمشدگی کا یہ معمّہ حل ہو ہی گیا۔

اسے اپنی تصویر کا یہ حال دیکھ کر یوں لگا جیسے یہ ٹکڑا اس کی تصویر کے، اس کی تصویر کے مضبوط فریم کے نہ ہوں، یہ بکھری کرچیاں شیشے نہ ہوں بلکہ وہ خود ریزہ ریزہ ہوا، کہیں سے ٹوٹا، کہیں سے ابھرا تو کہیں سے دبا ہوا کمرے میں چاروں طرف بکھرا پڑا ہو۔ یہ کاغذ کے ٹکڑے، شیشوں کی کرچیاں اس کا اپنا وجود ہے جو چھ برس سے اس فریم میں قید ہو کر کارنس پر پڑا تنہائی کا عذاب جھیل رہا تھا، اب ہر طرح کی قید و بند سے نجات پا گیا ہے، آزاد ہو گیا ہے۔

اس نے آخری بار تہیہ کیا کہ اب چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ خیالات کو دور پردیس میں بیٹھ کر اپنے وطن کی طرف مراجعت نہ کرنے دے گا۔

بہتے پانیوں کی آگ

"ڈیڈی جی آج سولو کی ممی نے بھی شرارت کی ہے جو انکل جی انھیں پیٹ رہے ہیں۔" کل رات میرا چھوٹا لڑکا نیند سے جاگ گیا تھا اور مجھ سے بظاہر عام سا معصوم سوال پوچھ رہا تھا۔ میں نے کتاب پر سے نظریں اٹھائیں اور عزیر کی آواز کی طرف دھیان دیا۔ سوچنے لگا کہ اُسے کیا جواب دوں۔ بچّہ ہے نا، اس کے سوال کا جواب بھی تو ایسا ہونا چاہیے کہ اس کے ننھے سے دماغ میں سما سکے۔ "بیٹے۔ کبھی بار یوں نہیں ہوا کہ تمھیں پیاس لگی ہو، تم شعیب سے پانی مانگو، وہ تمھیں پانی دے۔ پانی کا گلاس تمھارے ننھے ننھے ہاتھوں سے پھسل کر گرے اور ٹوٹ جائے۔ ایسے موقعوں پر شعیب کیا تمھیں پیٹ نہیں دیتا۔ اسی طرح شرارت انکل جی کی ہے۔ لیکن چونکہ وہ سولو کی ممی سے بڑے ہیں اور شہ زور بھی، اس لیے سولو کی ممی کو مار رہے ہیں۔ کیونکہ شاید اسی طرح انکل جی کے اشارے پر سولو کی ممی کی طرف سے دیا گیا گلاس وہ خود سنبھال نہیں پائے اور اُن کے ہاتھوں سے گلاس پھسل کر سارا پانی بہہ گیا۔ قصور اُن کا ہے۔ لیکن پٹائی لگ گئی بیچاری سولو کی ممی کی۔"

میری بات عزیر کی کچھ سمجھ میں آئی، کچھ نہ آئی۔ اپنی ممی کی آواز سن کر "پھر جاگ گئے، سوتے ہو کہ نہیں؟" وہ جھوٹ موٹ آنکھیں بند

کر کے ایسا بن گیا جیسے گہری نیند سو رہا ہو۔ وہ سوال جو بے اختیارانہ اس نے
مجھ سے پوچھا تھا گویا جاگ کر نہیں سوتے میں بڑبڑاتے ہوئے پوچھا ہو۔
میں پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ چوبارے میں سے اسی طرح اٹھا پٹخ
اور توڑ پھوڑ کی آوازیں آتی رہیں۔

دنیا میں بھی کیسے کیسے لوگ پڑے ہیں۔ اب ہمارے ان اوپر والے
کرایہ داروں کو ہی لے لیجیے۔ سونو کے ڈیڈی پچاس سے کسی بھی طرح کم
نہیں۔ جب کہ سونو کی ممی زیادہ ہوں گی تو یہی بس بیس بائیس کی! بالکل
چھوئی موئی کی شاخوں سی۔ رنگت ایسی کہ اندھیرا کمرہ روشن ہو اٹھے۔ ہم
لوگ.... اس مکان میں نئے نئے آئے ہیں.... شہناز نے کسی پڑوسن
سے سُنا تھا کہ یہ شرما جی کی تیسری شادی ہے۔ پہلی دو بیویاں ان کے
بے رحمانہ سلوک سے تنگ آ کر بن آئی موت مر چکی ہیں اور یہ بھی کہ اس
تیسری بیوی سے ایک بچہ ہو جانے کے باوجود بھی وہ پتہ نہیں کس لیے اسے
مارتے رہتے ہیں۔ ان سنی سنائی باتوں میں میری بیوی نے اپنی طرف
سے کیا کچھ شامل کیا ہو گا یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ.... ایک گھر والی
جب کوئی بات سن کر آگے کہتی ہے تو اس میں اپنی طرف سے نمک مرچ
لگانا بھی اپنا حق سمجھتی ہے۔ لیکن پتہ نہیں پھر بھی کیوں میرے بار بار روکنے پر
کہ "بھئی ہمیں کیا۔ ان کے گھر کا معاملہ ہے، تم کیوں خوامخواہ سوچ سوچ کر
کر دُبلی ہوتی جا رہی ہو"۔ وہ موقع بہ موقع یہ ذکر چھیڑ ہی بیٹھتی ہے اور ہمیشہ
اپنی ہم جنس کی بے قصوری ثابت کرنے پر تلی رہتی ہے۔

بیوی پالنے کے اور خواہ کتنے ہی فائدے کیوں نہ ہوں، ایک نقصان
ایسا بھی ہے جو اگر زیادہ گہرائی سے سوچا جائے تو شاید ان سب فوائد پر
پانی پھیر دے۔ وہ یہ کہ آپ کے سر میں درد ہے، آپ کا دل کسی دلچسپ
سے افسانے کے کلائمکس کو دوبارہ پڑھنے کو چاہتا ہے یا آپ آنکھیں موند کر

خاموش بیٹھنا چاہتے ہیں لیکن اردھانگنی ہے کہ باتوں کی رننگ کمینٹری میں لنچ بریک کی بھی قائل نہیں۔ یہ فطری خامی میری بیوی میں اگر نہ ہوتی تو اسے عورت کون کہتا۔ آپ سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن ریڈیو اسٹیشن کی لائٹ فیل کر دینے کے مجاز نہیں۔

بہر حال اب مسز نے عزیز کو تو آنکھیں بند کر کے سو جانے کا حکم دیا۔ اور اپنے کان اوپر سے آرہی آوازوں کے لیے مخصوص کر دیے۔ مجھے اس سارے گورکھ دھندے سے اگر کچھ دلچسپی ہے تو صرف اتنی سی کہ اچھی خاصی پری چہرہ دوشیزہ ایک بوڑھے گدھ کے پلّے بندھ گئی ہے۔ وہ بوڑھا گدھ اپنے پنجوں میں اسے دبوچنا چاہتا ہے جب کہ... اس کی گرفت میں اب بالکل دم نہیں رہا۔ وہ لہو لہان کر سکتا ہے، اور کچھ نہیں جو اکثر اپنے شکار کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بجائے اسے سسکتا ہوا چھوڑ کر تھکا ہارا اور ہانپتا ہوا جائے شکار سے فرار ہونے میں اپنی عافیت سمجھتا ہے —

میں نے کئی بار سیڑھیوں پر سے اترتے ہوئے، کوٹھی کے آہنی گیٹ کو چھو کر گذرتے ہوئے یا پھر سائیکل پر نکلتے ہوئے سولو کی ممی کو کافی پاس سے دیکھا ہے۔ اس کا لَو دیتا ہوا بدن مسٹر شرما جیسے تو کیا ایک بانکے چھبیلے نوجوان کو بھی جھلس کر رکھ دینے کی تاب رکھتا ہے۔ اس کے پاس سے گذرتے ہوئے اکثر اس بے پناہ حرارت کا مجھے خود بھی احساس ہوا ہے۔ کئی بار وہی مقناطیسی کشش مجھے بُری طرح اپنی طرف کھینچتی معلوم ہوئی ہے مگر ایک شریف اور وفادار شوہر ہونے کی حیثیت سے سوائے ایک آدھ بار کے میرے ارادوں میں لغزش نہیں آئی۔ ایک آدھ بار پاؤں ڈگمگا جانے کو تو آپ مرد کی فطرت کہہ سکتے ہیں۔ سو میں بھی ڈگمگایا ضرور لیکن گرا کبھی نہیں۔

شروع شروع میں، میں اسے مسٹر شرما کی جوان بیٹی سمجھتا تھا۔ دیکھنے میں وہ اس سے زیادہ اور کچھ لگتی بھی نہیں۔ جب حقیقت معلوم ہوئی، اس سے مسز شرما کے طور پر متعارف ہونے کا موقع آیا تو بڑی کوفت ہوئی۔ ایسی شادیاں عموماً اُن لڑکیوں کا مقدر ہوتی ہیں جو غریب گھرانوں کی ہوں۔ والدین ٹی۔وی، فریج، اسکوٹر دینے کی سکت نہ رکھتے ہوں۔ اپنے ہونے والے داماد کو "گفٹ چیک" نہ دے سکتے ہوں۔ ان کے پاس جہیز کے نام پر دینے کے لیے صرف لڑکی ہوتی ہے یا دُعائیں۔ وہ دعائیں بھی شاید غریبوں کی ہونے کے باعث قبول نہیں ہوتیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ایسی ہاتھ لگائے کُمھلا جانے والی لڑکیوں کے والدین بھی بوڑھے اور رنڈوے داماد تو نہ مانگتے ہوں گے۔ مالدار گھرانو کی بھدّی بھدّی، مُر مُردوں کے تھیلوں ایسی لڑکیوں کے نہایت گورے چٹّے اور ہینڈسم خاوند دیکھ کر بھی یہی تاثر اُبھرتا ہے کہ دُعاؤں کی قبولیت کے لیے بھی ہیرے جواہرات کی ریل پیل اور فیملی میں آگے پیچھے بڑے بڑے افسر رشتہ داروں کی دھکم پیل زیادہ کاؤنٹ کرتی ہے۔

ہمارے سماج میں اس طرح کی شادیاں کافی عام ہوگئی ہیں۔ رنگ روپ، شرافت، نجابت، اصل نسل اور تعلیم وغیرہ کچھ خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ اصل چیز پیسہ ہے۔ عزّت وِزّت گئی بھاڑ میں۔ حسب نسب کو شہد لگاکر چاٹتے رہو۔ کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔ غریب گھرانوں کے چاند ادھیڑ عمر کے رنڈوے مردوں کے آنگن میں ہی اترنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک چاند مسٹر شرما کے آنگن میں چاندنی بکھیرتے بکھیرتے گہنایا جارہا ہے۔ عمروں کے تفاوت نے جسمانی تقاضوں کی ناآسودگی کو جنم دینا ہی تھا۔ چڑھی ہوئی ندی اور شباب کی آمد آمد میں کوئی خاص فرق تو ہوتا نہیں۔ ایک طرف تجربہ کاری لازم ہے تو دوسری جانب مانجھی کے بازوؤں میں بھی دم ہونا چاہیے۔ ورنہ عین منجدھار میں بازو شل ہوجائیں تو کشتی کا خدا ہی حافظ ہوتا

ہے۔ ایسی بیٹریاں کناروں پر تھوڑی لگی ہیں۔

جس روز سرِ شام ہی دھواں دھار گھٹائیں گھر آئیں، مست پَوَن کی اٹھکیلیوں سے درختوں کی "کچی کچی" شاخیں اپنا آپ سنبھالتے سنبھالتے لہرانے لگیں، رم جھم شروع ہو جائے تو میری بیوی ہنسی ہنسی میں اکثر کہا کرتی ہے۔ "لو جی اوپر آج پھر کوئی ہنگامہ ہوگا۔" عموماً ہوتا بھی کچھ یونہی ہے۔ بادلوں کی گرج چمک، دروازوں کھڑکیوں کے کواڑوں کے مِل مِل کر جُدا ہونے، ٹکرانے اور بارش کی جلترنگ کے ساتھ ساتھ بیک گراؤنڈ میوزک کی طرح اوپر والے کمرے سے مسٹر اور مسز شرما کی "ہائے" اور بھی بلند ہوتی رہتی ہے۔

اس طرح کی شادی سے والدین تو اپنے سر کا بوجھ اتار دیتے ہیں۔ لیکن کبھی انھیں یہ بھی خیال آیا ہے کہ جسے وہ ان چاہا بوجھ سمجھتے رہتے تھے اور اپنے پالن ہار سے دن رات دعائیں مانگا کرتے تھے کہ ان کے سر پر سے یہ بوجھ جیسے تیسے بھی ہو اُتر جائے، اس غریب اور مظلوم پر انھوں نے اپنے ہی ہاتھوں اور دعاؤں سے عالمِ شباب میں ہی پیری کا بوجھ لاد دیا ہے جو اس بوجھ سے یقیناً کہیں زیادہ ہے جس سے نجات کے لیے وہ گڑگڑا کر دُعائیں مانگتے آئے ہیں۔ اس خود غرض سماج میں ہمیشہ یونہی ہوتا آیا ہے۔ ہر شخص اپنے گناہوں کی گٹھری دوسرے کے سر پر دیکھنا چاہتا ہے لیکن کیا والدین نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ ان کے کیے کی سزائیں ایک معصوم عمر بھر کیوں بھگتے۔ خود کو دور اندیش کہلوانے والے یہ لوگ حالات کو جذبات پر ترجیح دے کر منصف بنے گھومتے ہیں۔ شاید یہی وہ انصاف ہے جو سولو کی ممی کو پٹائی کی شکل میں ہر ہفتے، دس دن میں ایک آدھ بار آس پڑوس والوں کی نظر میں بے قصور ثابت کرتا رہتا ہے۔

میرے قبضے میں اگر الٰہ دین کا چراغ ہوتا تو میں آناً فاناً ایک

جن کو حاضر کر کے حکم دیتا کہ وہ مسٹر شرما کی عمر کے تیس سال کم کر دے۔ یہ ممکن نہ ہو تو سونو کی ممی میں اتنی تبدیلی لا دے کہ اس کی رنگت ماند پڑ جائے، کھلا کھلا چہرہ جھریوں سے بھر جائے اور اس کی عمر میں بیس بائیس سال کا اور اضافہ کر کے اس کی خواہشات کے سمندر کو پر سکون کر دے تاکہ اس کی جوان امنگیں ٹھہر سی جائیں اور یہ روز روز کا شور شرابہ ختم ہو۔

میں نے غور سے عزیز کی طرف دیکھا۔ وہ نیند کی وادیوں میں پہنچ چکا تھا۔ موسلا دھار بارش نے موسم کو بیحد رنگین بنا دیا تھا۔ بلب کی روشنی بار بار کپکپاتی تھی۔ ایسے پُر بہار موسم میں کتابوں کی دنیا میں کھوئے رہنا قدرت کی عنایتوں کی تحقیر ہے۔ اکنامکس جیسے خشک مضمون کی کتاب کا وہ باب ادھورا چھوڑ کر، لائٹ آف کر کے میں بھی لحاف میں گھس گیا۔ اب کمرے کے باہر اور اندر کے موسم میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔

بند مٹھی کا بھرم

اور پھر اسے اپنے ہی گھر سے یوں نکلنا پڑا جیسے فسادیوں کے خوف سے چھپتے چھپاتے رفیوجی کیمپوں کی طرف بھاگتے ہوئے معصوم اور بے قصور لوگ۔ در و دیوار سے لپٹی ہوئی یادوں کی پرچھائیاں، اپنا شہر، اپنے لوگ، اپنا گھر در، مٹتی ابھرتی ہوئی یادیں، پرچھائیوں کی صورت ابھی تک اس کا پیچھا کرتی ہیں۔ اُسے در بدر ہوئے کوئی زیادہ عرصہ بھی تو نہیں ہوا۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب واقعات پچھلے کسی جنم کا حصّہ ہیں۔

اکثر یوں ہوتا ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو ہوم ورک کروا رہا ہے کہ منّا کوئی کتاب پڑھتا ہوا اس سے پوچھ لیتا ہے۔ "پاپا جب سردیاں آتی ہیں تو برفیلے علاقوں سے سارس اور بگلے گرم میدانوں کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔ پاپا۔ یہ ہجرت کیا ہوتی ہے؟" وہ جواب دیتا ہے۔ "جب ماحول میں سٹھرن، گھٹن زیادہ بڑھ جائے، اپنے گھونسلوں میں رہنا بھی نرک کے سمان ہو جائے تو پرندے اپنے اپنے گھونسلے چھوڑ کر اس بھروسے پر دوسرے علاقوں کی طرف نکل پڑتے ہیں کہ موسم اور حالات سازگار ہوتے ہی پھر اپنے گھروندوں کی طرف پلٹ آئیں گے۔ موسم اور حالات سے ڈر کر، بہتر موسم اور خوشگوار حالات کی تلاش میں نکل پڑنے کو ہی بیٹے

ہجرت کہتے ہیں"۔

اس کی بات دس سال کے بچے کی سمجھ میں کچھ آئی کچھ نہیں۔ پھر بھی اس سے وہ دوبارہ سوال کر بیٹھتا ہے۔ "اچھا بابا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہجرت کوئی بری چیز نہیں۔ بلکہ یہ تو ایک طرح سے اپنے آپ کو خراب موسم سے، برے حالات سے بچانے کا ایک فطری تقاضہ ہے"۔ وہ نہایت عجلت سے جواب دیتا ہے۔ "بالکل ٹھیک بیٹے، تم ٹھیک سمجھے"۔

اور وہ خود ہجرت کے اس نہایت واہیات مطلب کو غلط قرار دینے کی خواہش کے باوجود اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ اپنے لاڈلے کو ہجرت جیسے لفظ سے جڑی ہوئی بے شمار یادوں میں اپنا شریک بنا سکے۔ وہ نقشہ اس کے سامنے گھوم جاتا ہے جب وہ اپنے سگے سمبندھیوں کے درمیان سے چپ چاپ بادلِ نخواستہ اٹھ آیا تھا۔ اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ گھر والوں سے پوچھ سکتا کہ کیا رشتے ناطے بندھن سب پیسوں کی زنجیروں سے بندھے رہتے ہیں۔ کیا ہوا جو وہ چند ماہ سے مالی پریشانیوں کے باعث ان کی امداد سے ہاتھ کھینچ لینے پر مجبور رہا ہے۔ وہ کیا جانیں کہ پردیس میں کس طرح سے دن کاٹے جاتے ہیں۔ انھیں تو ہر ماہ پابندی سے تنخواہ چاہیے۔ وہ چاہے بھوکا رہے، قرض کے بوجھ تلے دبا رہے، غیروں کا دست نگر ہو لیکن انھیں پوسٹ مین سے کسی مہینے بھی یہ سننے کو نہ ملے کہ اس بار منی آرڈر نہیں آیا۔

اگر وہ اپنے بیٹے کو منی آرڈر اور ہجرت کا تعلق سمجھانا بھی چاہے تو وہ معصوم سمجھ نہ سکے گا۔ ہجرت اور منی آرڈر بظاہر دو الگ الگ چیزیں ہیں لیکن آپس میں جتنا گہرا رشتہ ان کا ہے، شاید ہی دنیا کا کوئی رشتہ اتنا پائیدار ہوگا۔ اسے یاد پڑتا ہے کہ جب تک وہ منی آرڈر بھجواتا رہا، اسے گھر والوں کے خطوط برابر ملتے رہے۔ ہر دوسرے

چوتھے روز کسی نہ کسی کا خط اور کوئی نہ کوئی نئی اطلاع۔ "پاکستان سے تایا ابا آئے تھے، تمھیں پوچھ رہے تھے۔ تمھارے لیے ایک شرٹ پیس دے گئے ہیں، بڑا ہی خوبصورت ہے۔" دوسرے خط سے پتہ چلتا۔ "تمھاری قمیض درزی نے تیار کر دی تھی، بھجوا رہی ہوں، تمھیں ضرور پسند آئے گی۔" اگلے خط میں لکھا ہوتا: "تمھیں گنے کے رس کی کھیر بہت پسند ہے نا! تم یہاں نہیں ہو، اس لیے گھر میں یہ کھیر نہیں بنے گی۔ ہاں اگلے ہفتے تم آ رہے ہو تو تمھارے ساتھ ہم بھی کھالیں گے۔"

آج اُسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب خطوط منی آرڈر کے ساتھ جُڑے ہوئے تھے۔ جیسے جیسے منی آرڈر بھجوانے میں وقفہ بڑھتا رہا، اسی حساب سے خطوط کی تعداد اور مضامین بھی سکڑتے چلے گئے اور آخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ اس پوزیشن میں نہ رہا، منی آرڈر کا یہ سلسلہ جاری رکھ سکے۔ مجبوراً اسے منقطع کرنا پڑا۔ البتہ گھر والوں کو اس کی پیشگی اطلاع دے دی گئی۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ خطوط کا تانتا بھی رُک گیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کاغذ کے سلام آنے ہی بند ہو گئے۔ اتنا طویل ہوتے ہوئے بھی کتنا مختصر تھا خطوں کا یہ دلفریب اور دلفگار موسم۔

وہ ہر شام دفتر سے لوٹتے ہی بیوی سے ڈاک کا پتہ کرتا۔ جواب یہی ملتا کہ گھر سے کوئی خط نہیں آیا۔ اُسے ایک دم شاک سا لگتا۔ آہستہ آہستہ وہ اس برقی جھٹکے کا عادی ہوتا گیا۔ اور اسے معمول کا ایک حصّہ سمجھنے لگا۔

ابھی پچھلے دنوں اسے اپنی ڈاک میں ایک لفافے پر جانی پہچانی تحریر نظر آئی۔ اب اسے اتنی مہارت ہو گئی تھی کہ وہ ڈھیر سارے خطوط میں سے گھر سے آیا ہوا خط نکال لے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خدا خیر کرے۔ آج انھیں ایک غریب الوطن کی یاد کیسے آ گئی۔ وہ جو نصف درجن بھائی بہنوں اور والدین کے ہوتے ہوئے بھی اس دنیا میں یکا و تنہا تھا، اس معجزے پر حیرت اور خوشی سے کانپ اٹھا مگر لفافہ کھولتے ہی اس کی خوشی کافور ہو گئی۔ اور اس کی جگہ

ازلی مایوسی اور اداسی نے بے لی جواب اسے بے سہارا جان کر اس کے ارد گرد منڈلا رہی تھی۔ اتنے برسوں بعد کوئی خیر خبر آئی بھی تو صرف یہی کہ چھوٹے بھائی کی شادی ہے۔ کسی نہ کسی طرح پانچ ہزار کا انتظام کر کے چلے آؤ۔

قسمت اس کے ساتھ کیسا سلوک کر رہی تھی۔ بلاوا بھی تھا مگر مشروط۔ صاف ظاہر تھا کہ اگر وہ پانچ ہزار کا انتظام کر سکے تو گھر آجائے۔ بصورتِ دیگر اسے آنے کی زحمت گوارا کرنے کی ضرورت نہیں۔

اب اس کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک اس کے اپنے گھر کی طرف جاتا تھا۔ جہاں پہنچنے کے لیے پانچ ہزار روپے کا انتظام لازمی تھا۔ خالی ہاتھ جانے پر اس کے گھر کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہونا یقینی تھے۔ دوسرا راستہ نامعلوم منزلوں کی طرف ہجرت کا تھا۔ اس پر چلنے کی مناہی نہ تھی بلکہ اسے مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ دوسرے راستے پر چل نکلے ورنہ خیر نہیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب پہلے راستے پر قدم رکھنا مشکل ہے۔ البتہ دوسرا راستہ اسے خوش آمدید کہہ رہا ہے۔

پھر بھی کسی نہ کسی طرح اپنی انا کو طاق پر رکھتے ہوئے بجھے ہوئے دل سے اس نے خالی ہاتھ بھائی کی شادی میں شریک ہونے کی ٹھان لی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی بڑی بھابی کے ایک زہر بجھے جملے نے اس کا سواگت کیا۔ "آپ کیسے آگئے؟ کوئی بلانے گیا تھا؟" وہ وہمی نہیں تھا مگر پھر بھی اس کو لگا کہ صورت غلط ہو گیا ہے۔ اب اسے برے انجام کے لیے تیار بر تیار رہنا چاہیے۔

شادی میں کسی نے اس کو بن بلائے مہمان سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ وہ اپنے ہی گھر اجنبیوں کی طرح مارا مارا الٹے سیدھے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لیے دوڑتا رہا۔ لیکن ہر کام اس سے پہلے ہی کوئی اچک لے جاتا تھا۔ گویا سازش رچی جا چکی تھی اور اسے ہر صورت میں یہ جتلا دینا تھا کہ اس

کے بنا کون سے کام بند ہیں۔ جوں توں کر کے رات ہو گئی۔

رات ہو گئی تو وہ کمرہ جو کبھی اس کا رین بسیرا ہوا کرتا تھا، یہ کہہ کر اس سے کھلوا لیا گیا کہ اس میں گھر میں آیا نیا فرنیچر رکھوانا ہے۔ جگہ کی تنگی ہے۔ اس لیے اب اسے کھلے میں ہی سونا پڑے گا۔ (ورنہ وہ چاہے تو جاگ کر بھی رات گذار سکتا ہے) اسے بچپن میں پڑھا عرب بدّو کا قصّہ یاد آیا جسے محض اپنی سادگی اور دریا دلی کے باعث ایک اونٹ کو سر چھپانے کی جگہ دینے کی غلطی کرنے کے جرم میں اپنے خیمے سے باہر نکل جانا پڑا تھا۔ وہی حال اس کا بھی ہو رہا تھا۔ اگر وہ شروع میں ہی موم کی ناک نہ بنتا تو آج یہ ذلت اس کا مقدر نہ بنتی۔ وہ رات اس نے جوں توں کانٹوں پر کروٹیں بدل بدل کر کاٹ لی۔ صبح ہوئی تو اپنے ساتھ ایک تازہ اور نیا ہنگامہ لائی ـــــ

جب اس نے پردیس واپس لوٹنے کا ارادہ ظاہر کیا تو گھر کے سب لوگ اس کے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ یک بارگی تو اسے یوں لگا جیسے نہتا حسینؓ یزیدی لشکر کے نرغے میں پھنس گیا ہو۔ گھر والوں کے وہی تیور، وہی نیزہ بازی، تیر افگنی کی طرح جملے بازی۔ ہدف صرف اس کی ذات۔ مطالبہ، شادی پر اٹھے اخراجات کے قرض کی ادائیگی میں اسے حصّے دار بنانے کا۔ اس ناانصافی پر اس کے احتجاج کرنے کی دیر تھی کہ سب اس کے دشمن ہو گئے۔ گھر والوں نے اس کا تماشہ دیکھنے کے لیے پاس پڑوس والوں کو پہلے ہی مدعو کر رکھا تھا کہ یہ نیک کام بھی سب کے سامنے ہی بحسن و خوبی انجام پائے۔ کوئی اس ناٹک سے محروم نہ رہ جائے۔ کیا پتہ پھر وہ ہجرت سے واپس بھی پلٹے یا کہیں حالتِ سفر میں ہی آب و آتش و خاک و باد میں مل جائے۔ ایسے میں اس نے مناسب یہی جانا کہ بہ حالتِ مجبوری اس گھر کو خیر باد کہے اور ہجرت کر جائے۔ وہ حسینؓ تو نہیں تھا جو حق کے لیے باطل سے معرکہ آرا ہو سکتا۔ بلکہ وہ بزدلوں کی طرح میدانِ کارزار سے بھاگ آیا۔ آج وہ

سوچتا ہے۔ کاش وہ اس روز دلیری سے کام لیتا اور باطل کے سامنے سینہ سپر ہو کر اپنی بات منوانے کے لیے جان نچھاور کرتا تو کوئی بات بھی تھی۔

مُنّا یہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ بعض وقت پاپا کو کیا ہو جاتا ہے۔ وہ ایک معمولی سے سوال میں اتنا الجھ کیوں جاتے ہیں۔ اتنا کھو کیوں جاتے ہیں۔ اداس کیوں ہو جاتے ہیں۔ اگر پاپا کسی اسکول میں سر ہوتے تو.... وہ پاپا کو اس بھنور سے نکالنے کے لیے ایک اور سوال پوچھ بیٹھتا ہے۔ "پاپا، کیا سرد علاقوں سے آئے پرندے گرمیاں شروع ہوتے ہی دوبارہ سرد علاقوں کی طرف کوچ کر جاتے ہیں اور ان کی ہجرت ختم ہو جاتی ہے"۔ وہ چونکہ اپنی ہجرت کے پس منظر میں کہیں گم ہوتا ہے، اس لیے فوراً چونک کر جواب دیتا ہے۔" ہاں بیٹے، سرد علاقوں سے آئے پرندوں کی ہجرت گرمیوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے دیس جانے کے لیے آزاد ہوتے ہیں۔ لیکن بیٹے، انسانوں کی ہجرت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ مہاجر وہ خوددار، انا پرست لوگ ہوتے ہیں جو پھر پیچھے کی طرف پلٹ کر دیکھنا بھی پاپ سمجھتے ہیں۔ جس طرح تیز و تند ندیاں جو اپنے مخزن کی طرف کبھی نہیں پلٹتیں۔ آسمانوں کو چومتے ہوئے پہاڑ اگر چاہیں بھی تو پانی کے ان ٹھنڈے میٹھے بہتے دھاروں کو واپس اپنی طرف نہیں کھینچ سکتے، کبھی نہیں، ہرگز نہیں۔ اور ایک دن پہاڑوں سے بچھڑے ہوئے یہ دھارے سمندر میں جا ملتے ہیں۔ اپنی شناخت، اپنی پہچان گم کر بیٹھتے ہیں۔ وہ جو کبھی کسی کے نام سے، کسی کی نسبت سے پکار لیے جاتے تھے، نشان زد کر لیے جاتے تھے، بیکراں سمندر میں یوں سمندر بن جاتے ہیں کہ ان کا اپنا وجود، اپنا عدم ایک بند مٹھی کے بھرم سے زیادہ کچھ نہیں رہتا۔ کچھ نہیں رہتا۔"

بیتے موسم تازہ یادیں

"ہائے اللہ! چھوڑو بھی۔ کتنے بے شرم ہو۔ ساتھ والے کمرے میں وہ دونوں لڑکے ابھی جاگ رہے ہیں"۔ یہ صفیہ کی آواز تھی۔ مسٹر پرویز ہمارے نئے پڑوسی ہیں۔ نئی نئی لَو میرج ہے۔ پہلی رات کی پہلی صبح طلوع ہونے کے ساتھ شادی پرانی ہو جاتی ہے۔ لیکن انھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ ان کی پہلی رات کا سفر ابھی جاری ہے، جس میں دن ایک مختصر وقفہ کی حیثیت رکھتا ہے اور ان کی پہلی صبح ابھی شاید طلوع نہیں ہوئی۔

صبح ہوتے ہی میاں بیوی آفس کے لیے نکل کر دن بھر فائیلوں سے سر کھپا کر تھکے ہارے شام کو واپس آتے ہیں اور پھر وہی معمول شروع ہو جاتا ہے۔ اُن کے "ہائے اللہ"، "چھوڑو بھی" قسم کے جملے مسلسل کئی راتوں سے میری نیند حرام کر رہے ہیں۔ کئی بار ارادہ بھی کیا ہے کہ اپنے ان پڑوسیوں سے اشارتاً کچھ کہوں لیکن پھر سوچتا ہوں یہ اُن کے پُر لطف اور جنوں خیز لمحات میں بد مزگی پیدا کرنے والی بات ہوگی۔

"مائی سویٹ ہارٹ آشی! ذرا سوچو اگر میری جگہ تم ہوتیں تو کیا ایسے میں آرام کی نیند سو سکتی تھیں؟ ہرگز نہیں۔ دراصل یہ آوازیں میرے

ذہن کو آج سے پانچ برس پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ جب بعینہ اسی طرح کبھی تم بھی میرے ذرا سا چھیڑنے پر مچل جایا کرتی تھیں، نہیں نہیں کرنے لگتی تھیں لیکن تمھاری چند روزہ قربت سے مجھے اس قدر تو معلوم ہو ہی گیا تھا کہ یہ انکار تمھاری آمادگی اور اقرار کا مظہر ہوتا ہے۔

وہ دن بھی کتنے رنگین تھے۔ یاد ہے ہماری پہلی رات کا وہ منظر جب میں دبے پاؤں حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو تم نے، جو بیر بہوٹی بنی سرخ و زرتار ساڑھی میں کسی لپٹی بیٹھی تھیں، دروازے کی طرف نظریں اُٹھائیں اور مجھے دیکھ کر فوراً جھکا لیں گویا دیکھا ہی نہ ہو۔ تمھاری وہ پہلی نگاہ میرے خرمنِ دل پر برق کی طرح گری، جذبۂ شوق اور خوابیدہ تمناؤں کو بیدار کر گئی۔ میں تمھاری جانب بڑھا۔ دل میں اُمنگوں کا ایک طوفان بپا تھا۔ میں نے گھونگھٹے کے چاند کو چھونا چاہا تو تم اپنے آپ میں چھوئی موئی کی طرح سمٹ گئیں۔ بتدریج پیش رفت ہوئی اور بالآخر چاند آسمان سے میری گود میں آ رہا۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی لیکن آرزوئیں تھیں کہ مچل مچل جاتی تھیں، پیار اور نیند کے خمار سے بوجھل تمھاری سرمگیں آنکھوں میں سُرخ ڈورے تیرنے لگے تھے۔ دور کسی مندر میں بج رہے شنکھ کی میٹھی آواز رات کی تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی کانوں کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو چاند تاروں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ بادل کا کوئی شریر ٹکڑا چاند کو چھپا لیتا تو تاروں کی محفل ویران ہو جاتی۔ چاند تاروں کا یہ کھیل ابھی جاری تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بیڈ سوئچ آف کرنا پڑا۔ تمھاری شرمگیں اور خمار آلود آنکھوں میں سُرخ ڈورے اور بڑھ گئے تھے۔ رات بھی صبح سے بغلگیر ہونے لگی تھی۔

یہ ہماری پہلی رات تھی۔ سُن رکھا تھا کہ یہ رات زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے۔ یہی سوچ کر ہم دونوں نے اس رات کی رنگینی کے ایک ایک پل کا حساب کرنے میں بے حد فیاضی سے کام لیا تھا۔ پھر دن ہفتوں میں اور

ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے۔ یوں ہی دو سال بیت گئے۔

کتنے پُر بہار دن تھے!

میں نے تعلیم سے اسی برس فراغت پائی تھی۔ نئے سال نے مجھے ملازمت کے علاوہ آشی جیسا حسین تحفہ بھی دیا تھا۔ تمھیں تو شادی کی وجہ سے تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی۔ لیکن لگتا تھا مجھے پاکر تمھارے اس ادھورے پن کی تکمیل ہوگئی ہو۔ سبھی نے تمھیں بے پناہ پیار دیا تھا۔ امّی کی زبان تو آشی کی تعریفیں کرتے ہوئے تھکتی ہی نہیں تھی۔ نہ جانے گھر والوں پر تم نے کیا جادو کر دیا تھا؟ مجھے تو تم نے پہلے ہی سے مسحور کر رکھا تھا۔ وقت گذرتے دیر نہیں لگتی۔ شادی کے تیسرے سال تم نے مجھے ایک اور حسین تحفہ سے زیر بار کیا۔ در و دیوار کلکاریوں سے گونج اٹھے۔ کاشی تم پر گیا تھا۔ ویسے ہی تراشیدہ ہونٹ اور وہی تمھاری جیسی جھیل سی نیلگوں آنکھیں۔ تم ایک بند کلی سے سُرخ گلاب کی طرح کھِل اٹھی تھیں۔

تم نے میری قسمت بدل دی۔ کاشی کی پیدائش کے چند روز بعد میری ترقی ہوئی اور ساتھ ہی دہلی سے چنڈی گرھ تبادلہ ہوگیا۔ تم اس پرموشن پر پھولی نہ سمائی تھیں لیکن مجھ سے دوری کا عذاب تمھاری برداشت سے باہر تھا۔ جدائی کا نام آتے ہی تم افسردہ ہو جایا کرتی تھیں، چہرہ کمہلا جاتا تھا۔

مجھے یاد ہے اور شاید تمھیں بھی یاد ہو کہ جب میں پہلی بار چنڈی گڑھ کے لیے روانہ ہوا تھا تو انٹر اسٹیٹ بس ٹرمینل پر مجھے الوداع کہتے وقت تمھاری پلکیں بوجھل ہو گئی تھیں۔ تم نے رُندھے ہوئے گلے سے کہا تھا" میرے سرتاج! آج پہلی بار میں تمھارے بغیر رات گذاروں گی۔ شمع جلے گی لیکن اس کی لو پروانے کی پہنچ سے کوسوں دور ہوگی۔ آج کی رات تو میں آپ کی یاد میں پہلو بدل بدل کر گذار دوں گی۔ لیکن آخر کتنی راتیں ہیں اس فراق میں پگھل پگھل کر گذار سکوں گی"۔

میں نے وعدہ کیا تھا۔" حوصلہ رکھو آشی! چنڈی گڑھ کوئی امریکہ

تو ہے نہیں کہ برسوں آمد کا انتظار کرنا پڑے۔ میں اگلے ماہ کی پہلی تاریخوں میں تمھارے پاس لوٹ آؤں گا۔ اور تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ تمھاری طرح میری راتیں بھی تو ویران ہوں گی اور مجھے بھی تو جدائی کے یہ دن کسی نہ کسی طرح کاٹنے ہی ہوں گے۔ میں وہاں کوئی اچھی سی رہائش گاہ تلاش کرنے کے بعد تمھیں لے جاؤں گا۔"

تمھاری کچھ ہمت بندھی تھی۔ بس اسٹارٹ ہونے کی آواز نے تمھیں چونکا دیا۔ بس روانہ ہو رہی تھی لیکن مجھے تمھاری آنکھوں میں ایک کرب، ایک بے چارگی کی واضح جھلک نظر آگئی تھی۔ میں مجبور تھا۔ تنہائی کا یہ کرب آج کے انسان کا "مقدر" بن چکا ہے۔ مجھے الوداع کہتے ہوئے تمھارا ہاتھ بدستور اُٹھا ہوا تھا۔ بس نے رفتار پکڑی اور تم میری اور میں تمھاری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس واقعہ کو آج پورے دو سال بیت چکے ہیں۔ لیکن میرے ذہن کے دریچوں میں الوداع کہتے ہوئے تمھارے فسردہ چہرے کی وہ جھلک اب تک محفوظ ہے۔ پتھروں کے اس شہر میں جسے "سٹی بیوٹی فل" کا نام دیا گیا ہے۔ رہائش کا مسئلہ بہت سنگین ہے۔ تم سے جدا ہوتے وقت مجھے اس کا احساس نہیں تھا۔ اس لیے مَیں نے تمھیں اپنے ساتھ لے چلنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ لیکن مسلسل دو سال سے میں اپنا وعدہ وفا نہیں کر سکا۔ یہاں کمرے کم اور لوگ زیادہ ہیں۔ انسانوں کی ایک بھیڑ صبح اور شام سائیکلوں، اسکوٹروں پر اپنے اپنے دفتروں، اسکولوں، کالجوں کی طرف رواں دواں رہتی ہے۔ عجب مردم بیزار سا ماحول ہے۔ مدتوں سے ایک ہی کوٹھی میں ساتھ ساتھ رہ رہے لوگ ایک دوسرے کے دُکھ درد سے بے بہرہ ہیں۔ مروّت نام کی چیز اس شہر میں سرے سے غائب ہے۔ ایک دوسرے کا تعارف کبھی ناموں سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ متعارف کروانے کا سہرہ بھی پوسٹ مین کے سر ہے جو ایک ہی کوٹھی کے مکینوں کی ڈاک دروازے میں پھینک جاتا ہے۔ بعض وقت تو آدمی عجیب سی صورت حال میں پھنس

جاتا ہے۔ وہ کوئی "موسٹ ارجنٹ لیٹر" اٹھائے اپنے پڑوسی کو دینے جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ حضرت یوسف جمال نہیں، جمال احمد ہیں۔

تم دو ایک بار خود یہاں رہ کر اجنبی پن کے اس کرب کو جھیل چکی ہو اور میری مجبوریوں سے واقف ہو چکی ہو۔۔۔ اسی لیے تو اب تم مجھ سے بار بار ساتھ چلنے کا تقاضہ نہیں کرتیں۔ مجھ سے بات بے بات پر ناراض بھی نہیں ہوتیں۔ مجھے تمھاری بیچارگی کا بخوبی احساس ہے۔ گھومنے پھرنے کے یہی دن ہوتے ہیں۔ بعد میں کیسے اتنی فرصت نصیب ہوتی ہے کہ سیر سپاٹے کے لیے وقت نکال سکے۔ تمھارے قرب کی خواہش کی یہ شدت بڑھتی ضرور رہے گی لیکن بے سود۔ ہو سکتا ہے کہ وصال کی یہ شدید آرزو سسک سسک کر دم ہی توڑ دے لیکن خدا نہ کرے کہ وہ وقت آئے۔۔۔

سُنو! ساتھ والے کمرے میں پھر وہی ڈرامہ شروع ہو گیا ہے۔ "بس کرو اب! کیا سبھی ارمان آج ہی پورے کر لینے کا ارادہ ہے؟ میں آپ کے پاس ہی ہوں، کہیں جا تو نہیں رہی۔ پڑوسی کیا سوچیں گے!"

انھیں پڑوسیوں سے کیا لینا؟ وہ خواہ سوئیں، جاگیں یا روئیں۔ اگر یہی حالت رہی تو ہمیں، یہ کمرہ چھوڑ کر نیا آشیانہ تلاش کرنا پڑے گا۔ ورنہ.... تمھاری جدائی کے احساس کا یہ شیش ناگ ہر رات مجھے یونہی ڈستا رہے گا اور میرا وجود زہر کی اس آنچ میں قطرہ قطرہ پگھلتا جائے گا۔

اچھا! گڈ بائی!!

تمھارا،

غم نصیب شہزاد

سائے تری یادوں کے

بیتے موسموں کی یاد نہایت کربناک ہوتی ہے شبو! آج تمھاری مخروطی
انگلیوں نے میرا پتہ لکھ کر بیس سال پیچھے پلٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں خود کو بھول
سکتا ہوں لیکن اس تحریر کو نہیں۔ حوادث کی کتنی ہی تند و تیز آندھیاں اٹھیں
اور گذر گئیں لیکن لوحِ دل پہ نقش یہ تحریر اور بھی تابناک ہو کر ابھرتی رہی۔
ہماری پہلی اور اچانک ملاقات کا وہ دلفریب منظر مجھے آج تک یاد
ہے۔ ایک روز کالج سے واپسی پر گھر میں داخل ہوتے ہی ایک مانوس سی آواز
کانوں میں رس گھول گئی۔ تم باجی سے محوِ گفتگو تھیں:
"بھائی جان! یہ ہیں مس شبنم گلریز، امّی اکثر اپنی ایک سہیلی کا ذکر کیا
کرتی ہیں نا، مس شبنم گلریز انھیں خالہ منیزہ کی بیٹی ہیں اور ...."
"میں انھیں جانتا ہوں۔"
"ہائیں! تم، تم کیسے جانتے ہو؟"
"مسٹر پرویز بجا فرماتے ہیں۔ یہ میرے کلاس فیلو ہیں۔" یہ تمھاری
آواز تھی۔
"بھائی جان! مجھے تو آپ نے کبھی نہیں بتایا کہ مس گلریز آپ کے ساتھ
پڑھتی ہیں۔"

"باجی! دراصل میں انھیں مس شبنم کے طور پر جانتا ہوں۔ کالج میں مس شبنم گلریز سے تو کوئی واقف ہی نہیں۔" تم جو میری آمد سے پہلے دیوارِ قہقہہ بنی ہوئی تھیں، ایک بے جان مورتی کی طرح خاموش ہو گئیں۔

یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد ملاقاتوں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ چل نکلا۔ ایک دوسرے کو سمجھنے اور قریب سے جاننے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ بے رحم وقت لمحوں کو کچلتا رہا اور دن مہینوں میں بدلتے رہے۔ باجی سے تمھاری دوستی ہو گئی تھی۔ تم ہمارے گھر آنے لگیں۔ کبھی کبھار خالہ تمھارے ساتھ ہوتیں لیکن اکثر و بیشتر تم اکیلی ہی چلی آتی تھیں۔ بہ حیثیت کلاس فیلو مجھ سے بے تکلفی سے ملنے لگیں۔

بی۔ اے۔ فائنل کے ایگزام ختم ہو گئے، اب ریزلٹ کا انتظار تھا۔ ایک صبح میں ابھی سو ہی رہا تھا۔ یوں لگا جیسے خواب میں تم مجھے پکار رہی ہو۔

"پرویز! اب اُٹھ بھی جاؤ۔ اے گڈ نیوز فار یو۔"

میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا تھا حقیقتاً تم مجھے جھنجھوڑ رہی تھیں۔

"ہم دونوں فرسٹ کلاس میں پاس ہوئے ہیں۔"

نہ جانے تم نے "ہم" پر بے پناہ زور کیوں دیا تھا۔

"ارے! تمھیں اتنی اچھی خبر سُنائی، پھر بھی چُپ ہو۔ اس طرح کیوں گھور رہے ہو۔ کیا اس سے پہلے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا؟ اور ہاں! اس گڈ نیوز پر مجھے کوئی پرائز نہ دو گے؟"

میں تمھیں تکے جا رہا تھا۔

"صرف دیکھنے سے کام نہ چلے گا۔ انعام فی الحال نہ سہی، کم از کم وعدہ تو کر ہی لو۔"

"میں خود تم سے کچھ مانگنے والا تھا۔ سوچتا ہوں جو خود ہی کسی چیز کا طلب گار ہو، اس کے آگے ہاتھ کیا پھیلاؤں۔"

"ٹھیک ہے! تم یونہی سوچتے رہو۔ میں نے کچھ مانگ بھی لیا ——— اب تو...."

"میرے پاس دینے کے لیے کچھ ہے ہی کہاں۔ صرف میں بچا ہوں۔ اگر چاہو تو اس "مَیں" کو ہی بطور انعام لیتی جاؤ۔"

یہ سنتے ہی تم فوراً کمرے سے بھاگ گئی تھیں۔

○

جس طرح موسم پرندوں کو سرد علاقوں سے گرم ملکوں کی طرف دھکیل دیتا ہے، اسی طرح "ٹرانسفر آرڈر" ملازمین کو دربدر کرنے کا حکم رکھتے ہیں۔ جس طرح ایک تنومند درخت کو ایک جگہ سے جبراً اُکھاڑ کر کسی اور مقام پر لگانے کی کوشش میں بے چارہ پیڑ مرجھا جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حشر بعض اوقات "ٹرانسفر آرڈر" کے احکامات پر عمل پیرائی سے ملازموں کا بھی ہوتا ہے۔ شبنم کے والد بھی ان جاں گداز لمحوں سے دوچار ہونے والے تھے۔

تمھارے ڈیڈی کے دہرہ دون تبادلے کی خبر مجھے پریشان کر گئی۔ اس آخری شام کی ملاقات کی یاد ابھی تازہ ہے۔

"اُجالے کس قدر حسین ہیں۔"

"بالکل میری طرح صاف، شفاف و شاداب... کہو، رُک کیوں گئے؟" یہ تمھاری آواز تھی۔

"آئینہ دیکھا ہے کبھی! تم اتنی خوبرو نہیں ہو کہ سہانی شام سے تمھارا موازنہ کیا جا سکے۔"

"مجھے اس لائق کیوں سمجھا جائے۔ لیکن جناب نے مجھے بلوایا کیوں تھا؟

دل جلانے کے لیے نظرِ انتخاب مجھی پر پڑی تھی۔"

"دیکھا بن گئیں نا۔ اس حالت میں تم اور بھی حسین لگتی ہو۔ شاید تمھیں اس کا احساس نہیں ورنہ ...."

"ورنہ میں ہمیشہ غصّہ ہی میں رہوں۔"

"درست فرمایا۔ میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ ویسے ماشاءاللہ ہو بڑی سمجھ دار۔"

"اچھا! بس اب رہنے دو۔ اصلی موضوع پر آؤ۔ بھٹکنا ٹھیک نہیں۔ ہاں، کون سی ایسی بات ہوگئی ہے جو آج عالیجاہ نے ناچیز کو اس وقت یاد فرمایا؟"

"میں تمھیں چاہتا ہوں۔ تمھارے دل میں بھی میرے لیے یقیناً ایک نرم گوشہ موجود ہے۔ تمھارا شام ڈھلے یکا وتنہا اس طرح چلے آنا تو یہی ظاہر کرتا ہے اور ..."

"کیا۔۔!"

"اوہو! سنو تو سہی۔ خواہ اقرار کرو یا انکار لیکن اس حقیقت کو تم ہرگز جھٹلا نہیں سکتیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر جی نہیں سکتے۔ یاد ہے وہ صبح جب تم نے مجھ سے کچھ مانگا تھا۔ زمانے کے سرد و گرم میں مجھے بھول نہ جانا ورنہ مجھے اس مقولے پر ایمان لانا پڑے گا کہ ناپختہ ذہن کی لڑکیوں کی نفرتیں اور چاہتیں بہت تیز اور فوراً بدلنے والی ہوتی ہیں۔"

"میں اس دردِ مشترک کے تقدس کی قسم کھا کر وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کا یہ خدشہ ایک نہ ایک دن غلط ثابت ہو ہی جائے گا۔"

"سُنا ہے چند دنوں میں تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ گے۔ پھر اس بے نام سی خلش کا کیا ہوگا جو شبّو کے ایک آدھ دن نظر نہ آنے سے پیدا ہو جاتی ہے ۔۔"

"پُنر ملن کی خوشی احساسِ جُدائی کے رنج کو پنپنے ہی نہ دے گی۔"

آخری ملاقات پُر اُمید تھی۔

○

بالآخر تم لوگ دہرہ دُون چلے گئے۔ اب تمھارے محبّت نامے ہی میری تنہائیوں کے رفیق تھے۔ ہر خط میں یہ جملہ ضرور ہوتا۔
"میرا انعام 'مَیں' آپ کے پاس ہے۔ اسے میری امانت سمجھیے۔"
جواباً میں بھی لکھ دیتا۔ "شبّو! بے فکر رہو۔ تمھارا 'میں' ایک دن تمھیں مل ہی جائے گا۔"

○

وہ شام بڑی اُداس تھی۔ میرا خیال بار بار تمھاری طرف جاتا تھا۔ کئی روز سے تمھارے "کاغذی ہاتھوں کے سلام" کا منتظر تھا۔ دوسری صبح نامۂ محبت موصول ہوا۔
"جانِ شبنم!
آج کل پاپا میرے لیے کسی مناسب رشتے کی تلاش میں ہیں۔ کئی جگہ بات چل رہی ہے۔ یاد ہے، جس روز بی۔ اے فائنل کا ریزلٹ آیا تھا۔ میں نے تمھارے کمرے میں جاکر فرسٹ ڈویژن میں پاس ہونے کی خوشخبری سنائی تھی اور تم سے کچھ مانگا تھا۔ تم پہلے تو خاموشی سے میرا منھ تکتے رہے۔ کافی دیر بعد تم نے "مَیں" بطور انعام مجھے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ للہ مجھے اس بدنصیبی سے بچا لیجیے۔ تاکہ میرا "مَیں" کہیں کسی اور کا مقدّر نہ بن جائے۔"
تمھارا خط میں نے امّی کے سامنے رکھ دیا۔ اُن کی آنکھیں بھر آئیں۔

وہ فرطِ غم سے کچھ کہہ نہ پاتی تھیں۔ انھوں نے باجی کو آواز دی۔ میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں آگیا۔

تھوڑی دیر بعد باجی میرے پاس آئیں اور گویا ہوئیں۔

"پرویز! جب گلریز فیملی اور ہم لوگ میرٹھ میں ساتھ ساتھ والے بنگلے میں رہتے تھے تو ایک بار شبنم کی امی سخت بیمار پڑیں۔ شبنم ابھی چند ہی ماہ کی تھی۔ ڈاکٹر نے شبنم کو خالہ منیزہ کا دودھ پینے سے منع کر دیا۔ امی اس وقت وہیں تھیں۔ وہ شبنم کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ اب شبنم کا گذارہ بھی امی کے دودھ پر تھا۔ ان دنوں تمھاری عمر بہ مشکل سات، آٹھ ماہ رہی ہوگی۔ خالہ منیزہ قریب تین ماہ بعد صحت یاب ہوکر ہسپتال سے واپس لوٹیں۔ شبنم کو دوبارہ ان کے حوالے کر دیا گیا۔ اس طرح شبنم تمھاری دودھ شریک بہن بن گئی۔ ہمارے مذہب میں دودھ شریک بہن سے نکاح حرام ہے۔ شبنم اب کبھی تمھاری شریکِ حیات نہیں بن سکتی۔"

ہنسی ہنسی میں کیا گیا ایک وعدہ نبھانا کس قدر مشکل ہوگیا تھا۔ میں تمھارے اس خط کا جواب نہ دے پایا۔ اب میرے پاس لکھنے کو بچا بھی کیا تھا۔ سب کچھ امی کے اس انکشاف کے طوفان میں بہہ گیا تھا۔

یہ تمھارا آخری خط تھا۔

○

چند روز بعد ڈیڈی کے نام آئے ایک ویڈنگ کارڈ سے تمھاری شادی کی تصدیق ہوگئی۔ یہ اطلاع میرے لیے کسی ایٹمی دھماکے سے کم نہ تھی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد میں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ مستقبل جو پرفریب ہونے کے باعث ہمیشہ شاندار نظر آیا کرتا ہے۔ چاہتوں اور خوابوں کے سبھی محل مسمار ہوگئے۔ گھر والوں کی دلجوئی میری ناکامی اور محرومیت کے احساس کو اور ہوا دیتی تھی۔

وہ پہلا رت جگا تھا۔ اس کے بعد تو جیسے شب بیداری میری زندگی کا ایک حصّہ بن گئی۔

وقت سبھی زخموں کا مرہم بن جایا کرتا ہے۔ تمھاری جدائی کا یہ جان لیوا غم آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ زخم مندمل ہوتے گئے۔ میری شادی کے بعد زینی نے تمھاری کمی پوری کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن پہلی محبّت میں ناکامی کے داغ دل سے کبھی محو نہیں ہو پاتے شبّو! ٹوٹنے اور بکھرنے کا یہ عمل آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔

اپنی شادی کے صرف دو سال بعد ہی تم جاوید کے ساتھ پاکستان منتقل ہوگئیں۔ دو بہاریں گذریں اور دونوں بہاروں نے تمھیں رعنائی و زیبائی عطا کی۔ تمھارے گلشنِ حیات میں دو سُرخ گلاب کِھلے۔ جن کی مہک نے تمھارے آنگن اور تمھاری روح کو معطّر کردیا۔ تم غمِ دنیا سے یکدم بے نیاز ہوگئیں۔ تم خوش قسمت نکلیں۔ میری شادی کو چھ برس ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک تنہائی کے بے آب وگیاہ صحرا میں بھٹک رہا ہوں۔ زینی محض ایک خوشنما سُراب ہے اور کچھ نہیں۔

تم مجھ سے صرف پانچ گھنٹے کی مسافت پر آباد ہو لیکن میں اگر چاہوں تو پانچ صدیوں میں بھی تم تک نہیں پہنچ سکتا۔ فرار کی سبھی راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ دیواروں کے اس پار جھانکنا بھی گناہ متصوّر ہوتا ہے۔

شبّو! اگر ہم زندگی کے کسی موڑ پر اتفاقاً مل بھی گئے تو شاید تم اجنبی بن کر اپنے پرویز کے سامنے سے گذر جاؤ۔ تم لاابالی اور کھلنڈرے پرویز کو تلاشوگی لیکن ہر بار بجھی بجھی آنکھوں والے، اُداس اور رغمزدہ شخص کو سامنے دیکھ کر پشیمان ہوگی۔ تم مجھ سے صرف اور صرف ایک بار ملنے کی خواہشمند ہو۔ للّلہ اپنی اس خواہش کو تشنہ کام ہی رہنے دو تو بہتر ہے ورنہ ڈر ہے کہ راکھ تلے دبی کوئی چنگاری کہیں تمھاری پُرسکون زندگی کو جلاکر خاکستر نہ کردے●